تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

اکتوبر ۲۰۲۲ء

جلد ۲ فقہ اکیڈمی کا ترجمان شمارہ ۱۱

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	مدینے کا سفر ہے	اقبال عظیم	۴
اداریہ	ٹرانس جینڈر ایکٹ	مدیر	۶
درسِ قرآن	اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے اوصاف	مولانا محمد اقبال	۹
درسِ حدیث	تبدیلیِ جنس: لعنت زدہ فعل	ابنِ عباس	۱۳
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۶)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۱۵
مقالات	صنفی شناخت کی پالیٹیکل اکانومی	فرید بن مسعود	۲۰
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۹)	مولانا حماد احمد ترک	۲۳
مقالات	کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۳۳
فقہیات	القواعد الفقهية: القاعدة الرابعة	مفتی نذیر احمد ہاشمی	۳۷
یسئلونک	عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم	دار الافتاء، فقہ اکیڈمی	۳۹
ادبیات	ادھوری جدیدیت (۲)	سلیم احمد	۴۰
رحلات	افغان نامہ (۳)	مفتی اویس پاشا قرنی	۴۶

اقبال عظیم (۱۹۱۳ـ۲۰۰۰ء)
معروف نعت گو شاعر

مدینے کا سفر ہے

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

کہاں میں اور کہاں اس روضۂ اقدس کا نظارہ
نظر اس سمت اٹھتی ہے مگر دُزدیدہ دزدیدہ

غلامانِ محمد دور سے پہچانے جاتے ہیں
دلِ گرویدہ گرویدہ، سرِ شوریدہ شوریدہ

مدینے جا کے ہم سمجھے تقدس کس کو کہتے ہیں
ہوا پاکیزہ پاکیزہ، فضا سنجیدہ سنجیدہ

بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

وہی اقبالؔ جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

ٹرانس جینڈر ایکٹ

سیلاب کی تباہ کاریوں پر ابھی قابو پایا نہیں جاسکا تھا اور حکومت و اپوزیشن اور سیاسی جماعتوں کی اس بحث کا بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ سیلاب متاثرین کی اصل خدمت کس نے کی کہ ملک میں ٹرانس جینڈر ایکٹ نے دھوم مچا دی۔ اس کے بعد قوم کو ''ڈار اور ڈالر'' میں الجھا دیا گیا۔ شاعر نے شاید پاکستان ہی کے بارے میں کہا ہو:

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

جب ہمارا قاری یہ لفظ پڑھ رہا ہوگا پتا نہیں اس وقت تک کیا کیا ٹوٹ چکا ہوگا اور کتنے نئے ''گُل'' کھل چکے ہوں گے۔ لیکن اس وقت ہم اس متنازع قانون ہی کے بارے میں بات کرتے ہیں جو ٹرانس جینڈر ایکٹ کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ دینِ اسلام سے دوری، آسمانی مذاہب کی تحریف اور انسانوں کے اپنے تشکیل کردہ مختلف مذاہب کے رواج کے سبب پوری دنیا ''سحرِ جنس'' کا شکار ہے۔ اس جذبے کی تسکین کی خاطر بہت سارے نت نئے نظریے اور راستے بنائے گئے۔ ان راستوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اچھے خاصے کسی انسانی بہبود کے قانون و ضابطے میں کچھ ایسے چور دروازے بنا دیے جاتے ہیں جہاں سے جنس کے بازار کی طرف جھانکا جا سکے۔ ٹرانس جینڈر ایکٹ میں کچھ ایسا ہی کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وطنِ عزیز میں ''صنفِ ناقص'' جنھیں عرفِ عام میں خسرے یا انٹر سیکس کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ جی ہم نے اچھا سلوک کسی سے کیا ہو تو بتائیں جو آپ انٹر سیکس کے بارے میں ہم سے گلہ کرتے ہیں۔

بہرحال دوسری جنسوں کے ساتھ حسنِ سلوک نہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اللہ کی اس مخلوق ”جنسِ مخلوط“ کے ساتھ حسنِ سلوک کی قانون سازی نہ کی جائے۔ ضرور کی جائے لیکن اچھے طریقے سے قانون سازی کی جائے۔ خیر قانون سازی ہوئی لیکن کسی ساز باز کے سے انداز میں، بہرحال اب یہ معاملہ وفاقی شریعت کورٹ میں زیرِ بحث آچکا ہے اور مختلف اطراف کے لوگ بطورِ فریق اس مقدمے میں شمولیت کی درخواستیں دے رہے ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں اس قانون میں پائے جانے والے نقائص کی اصلاح کر دی جائے گی۔ اس قانون کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہمارے مقام و مرتبے سے اوپر کی بات ہے اس لیے ہم کچھ گزارشات اپنے اس دیوالیے کی بابت کرنا چاہتے ہیں جو اس طرح کے کئی مواقع پر سامنے آچکا ہے۔ موجودہ مسئلے نے یہ ثابت کیا کہ بحیثیتِ مجموعی ہم میں لیاقت و دیانت دونوں کی کمی ہے۔ بعض مخلصین وہ ہیں جو اس بل کو ہم جنس پرستی اور یک جنسی شادیوں کا قانون اور پروانہ قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سب الفاظ میں لکھا ہوا نہیں ہے ہاں اس کے مضمرات میں یقیناً شامل ہے۔ دوسری طرف وہ لبرل انتہا پسند ہیں جو اس الزام کی نفی کرتے ہوئے ایکٹ کو ایک قابلِ فخر کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ بلکہ معترض مسلمانوں کی مذمت کرتے کرتے اب وہ اسلام ہی کو برا بھلا کہنا شروع ہو گئے۔ جید علمائے کرام کا معتدل نظریہ اس بابت یہ ہے کہ اس بل میں بعض ایسے مبہم الفاظ و نکات شامل کیے گئے ہیں کہ جو مندرجہ بالا قبیح امور کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس بل کے پیش کار اور ترتیب کنندہ خواتین و حضرات کو بھی معصوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے لیکن ان کے بیانات اور عمومی کردار و رجحانات کو دیکھتے ہوئے شک گزرتا ہے کہ اس طرح کے مشکوک خلا شاید جان بوجھ کر رکھے گئے ہیں۔ ایک قانون ساز ادارے کے اراکین سے بڑھ کر قانونی موشگافیوں سے کون واقف ہو سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ ان لوگوں کو یہ واقفیت نہیں ہے تو یہ ستم بالائے ستم ہے۔ پھر گلستان کے انجام کا سوچیں کیسا ہو گا۔ سیاسی جماعتوں کے ”نابالغ“ کارکنوں کا حال دیکھیں کہ وہ اتنے سادہ لوح ہیں کہ ایک دوسرے کو اس بل کی منظوری کا ذمے دار قرار دے کر ایک دوسرے پر لعن طعن کر رہے ہیں حالانکہ سینیٹر ڈاکٹر مشتاق صاحب کے بیانات کے مطابق چار بڑی سیاسی جماعتوں کی خواتین ارکان اس بل کی ”پیش کاریاں“ تھیں اور اس بل سے اتفاق کرنے والے تو خیر سارے ہی تھے۔ فقہِ اسلامی میں ”صنفِ ناقص“ پر بہت تفصیل سے کلام کیا گیا

ہے۔ وضو، طہارت و غسل اور اس کے وجوب کی صورتیں، اذان و نماز اور امامت کے احکام، رضاعت خلوت و جلوت و سفرِ عمرہ، حج احرام کے مسائل، گواہی، میراث، حدود و تعزیرات، قصاص و دیت، لباس، زیور، تجہیز و تدفین حتیٰ کہ ان کے نکاح کے جواز و عدمِ جواز کی صورتوں پر بھی کلام کیا گیا ہے۔ ہیجڑوں کے متعلق مسائل میں سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ ان کی جنس و صنف کا تعین ہے۔ ہمارے فقہا نے اس پر بھی کلام کیا ہے۔ میڈیکل سائنس کی ترقی سے اس مسئلے کے کچھ نئے پہلو ضرور سامنے آئے ہیں۔ جنس کے تعین یا جسمانی بناوٹ اور نفسانی لگاوٹ کو کسی ایک جنس کی طرف یکسو کرنے میں جدید طبی سہولیات سے استفادے کے جواز و عدمِ جواز کی حدود و قیود اور شروط پر بھی علمائے کرام نے کلام کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قانون کی اصلاح کرتے وقت ملک کے نامور ماہرینِ شریعت سے ضرور راہنمائی لی جائے اور ان کی مشاورت سے نیا قانون بنایا جائے۔

*****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے اوصاف

سورۃ الفرقان آیت: ۶۳

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلامًا﴾

"اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں"۔

تفسیر و توضیح

اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں کے وہ عظیم اوصاف کیا ہیں، جن کی بنا پر یہ دیگر بندوں سے بلند تر ہیں، سورۂ فرقان کی آیت ۶۳ تا ۷۷ تک ان آیات میں اللہ جل شانہ نے اپنے خاص بندوں کی وہ خاص صفات بیان فرمائی ہیں، جو اُسے بہت ہی پسند اور محبوب ہیں اور جن کی بدولت وہ خاص بندے دیگر بندوں سے ممتاز ہیں۔ یہ وہ بلند و اعلیٰ اقدار و اوصاف ہیں کہ جن سے متّصف ہو کر کوئی شخص مدارجِ کمال طے کر سکتا ہے اور باریِ تعالیٰ کے خاص اور ممتاز بندوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ وہ اوصاف جن کے اختیار کرنے سے ایک بندہ "عباد الرحمٰن" کے لقب کا مستحق ٹھہرتا ہے، ان کا حاصل کل گیارہ اوصاف ہیں۔ یہاں ترتیب کے ساتھ ان اوصاف کو ان آیات کے مطالعے کے ضمن میں ذکر کیا جائے گا اور ساتھ ساتھ ان کی وضاحت بھی درج کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

عبادالرحمٰن کے اوصاف

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الأَرْضِ هَوْنًا﴾ ”اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں“۔ جنابِ باریِ تعالیٰ نے یہاں ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ﴾ فرماکر انتہائی محبت اور شفقت کا انداز اپنایا ہے، یعنی اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندے وہ ہیں جو ان اعلیٰ اوصاف کے حامل ہوں۔ ﴿يَمْشُونَ عَلَى الأَرْضِ هَوْنًا﴾ ”جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں“۔اس کا مطلب ہے: أي مشيًا لينا بسكينة ووقار وتواضع.(التفسير الوسيط للقرآن الكريم،ج:۷،ص:۱۵۳۸) ”وہ سکون، وقار اور انکساری کے ساتھ نرم چال چلتے ہیں“۔ چنانچہ مذکورہ اوصاف میں سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے نیک بندے عاجزی اور انکساری سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں متکبر بن کر نہیں رہتے۔ علامہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”پہلی صفت یہ ہے کہ انکساری سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے عقاب کے خوف، اس کے احکام کی معرفت اور اس کے عذاب کے ڈر کی بدولت ممکن ہے“۔(التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج،ج:۱۹،ص:۱۱۴) یہاں اس ارشاد سے دو باتیں پتا چلتی ہیں: ایک یہ کہ آدمی کی چال ڈھال اور اس کا انداز دراصل اس کی سیرت و کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ایک ظالم وجابر جو خودپسندی کے مَرَض میں گرفتار ہے اس کی چال اور ایک شریف النفس اور مہذَّب آدمی کی چال میں واضح فرق ہوتا ہے جسے باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے، کیونکہ آدمی کی چال و رفتار سے اس کی شخصیت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ لہٰذا جو واقعی اللہ کے بندے ہوتے ہیں ان کی چال ڈھال اور انداز و اطوار سے عاجزی اور فروتنی نمایاں ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو آقا نہیں بلکہ بندہ تصور کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ”اور زمین پر اتراتے ہوئے مت چلو“۔ یعنی فخر و غرور سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی چال ڈھال میں عاجزی و فروتنی اختیار کرنی چاہیے۔ اسی طرح اس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کاروبارِ زندگی اور معاشرے سے کٹ کر کسی گوشۂ تنہائی میں نہیں رہتے، بلکہ وہ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنی ذمے داریوں

اور فرائض کی ادائیگی میں مشغول رہتے ہیں اور لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے انکساری سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ معاشرے سے کٹ کر اگر کوئی شخص کسی پہاڑ یا غار میں زندگی بسر کر رہا ہو تو اسے پھر مذکورہ وصف اپنانے اور اس کے اظہار کا موقع کیسے میسر آئے گا، ظاہر ہے یہ منشائے حکمِ خداوندی کے خلاف ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس ارشاد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ بہ تکلف اپنے آپ کو ذلیل بنا کر پیش کریں یا ریاکاری سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو عاجز ثابت کرنے کی کوشش کریں یا مریض آدمی کی طرح دکھنے کا تکلف کیا جائے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا جو آہستہ چال چل رہا تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تمھیں کیا ہو گیا ہے، کیا تم بیمار ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے درہ اٹھایا اور اسے حکم دیا کہ قوت کے ساتھ قدم اٹھائے۔ (تفسیر ابنِ کثیر، ج:۶، ص:۱۱۰)﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلامًا﴾ ''اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں''۔ یعنی جب کبھی ان کا جاہلوں کے ساتھ مکالمہ ہوتا ہے تو وہ ان کی بدکلامی کا جواب شائستہ اور شریفانہ انداز میں دیتے ہوئے ان سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ الجھتے نہیں۔ علامہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دوسری صفت حلم، بردباری اور پاکیزہ وعمدہ گفتگو ہے۔ جب انھیں تکلیف پہنچائی جائے تو وہ برائی کا بدلہ احسان کے ساتھ دیتے ہیں''۔ (التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج، ج:۱۹، ص:۱۱۴) اسی طرح التفسير الوسيط للقرآن الكريم میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے: مَعْنَاه إِذَا تَكَلَّمَ مَعَهُمُ السُّفَهَاءُ بِالسّوءِ أَو بِكلامٍ يُؤْذِيهم ويَكَرَهونَ سَمَاعَهُ أَعْرَضُوا عنهم تَحَلُّمًا وسَمَاحَةً. (التفسير الوسيط للقرآن الكريم، ج:۷، ص:۱۵۳۹) ''اس کا مطلب ہے کہ جب احمق لوگ رحمٰن کے ان بندوں سے برائی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں یا ایسا طرزِ کلام اختیار کرتے ہیں جو ان کے لیے تکلیف کا باعث ہو تو وہ برے الفاظ میں جواب دینے کے بجائے ان سے بردباری اور عفو کا معاملہ کرتے ہوئے اعراض کرتے ہیں''۔ قرآنِ کریم میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿وَإِذا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقالُوا لَنا أَعْمالُنا وَلَكُمْ أَعْمالُكُمْ سَلامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجاهِلِينَ﴾ ''اور جب وہ

کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اسے ٹال جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ ہم تمھیں سلام کرتے ہیں، ہم نادان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے"۔ یہاں جاہل سے مراد ان پڑھ آدمی نہیں ہے بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت، ہٹ دھرمی اور بدتمیزی پر اتر آئے تو اس کے جواب میں شریف آدمی کا رویہ اور طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر الگ ہوجاتا ہے اور اس سے الجھ کر اپنا وقار خراب نہیں کرتا۔ کیونکہ اکثر اوقات ایسے جہلا کے ساتھ بحث ومباحثہ فائدے سے خالی ہوتا ہے، جب ایسی صورت حال ہو کہ انسان کو یہ اندازہ ہوجائے کہ اس کا مخاطب ہٹ دھرمی میں مبتلا ہے اور ضد اور عناد پر اتر آیا ہے اور کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے تو مناسب طریقہ اختیار کرکے اس سے الگ ہوجانا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ بحث ونزاع میں پڑکر بلاوجہ اپنا وقار مجروح نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس سے بعض امور مستثنیٰ ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مطلب یہ کہ اپنے نفس کے لیے انتقام قولی یا فعلی نہیں لیتے اور جو خشونت تادیب و اصلاح وسیاستِ شرعیہ یا اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے ہو، اس کی نفی مقصود نہیں۔ (بیان القرآن، ج:۳، ص:۳۲) لہٰذا اس آیتِ زیرِ مطالعہ میں مذکورہ اوصاف کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور چنیدہ بندے عاجزی وفروتنی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور متکبرانہ چال ڈھال سے دور رہتے ہیں۔ جب کبھی جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ شائستہ انداز میں انھیں نظر انداز کرتے ہوئے اور ان سے الجھے بغیر جدا ہوجاتے ہیں اور اپنے وقار کو مجروح نہیں کرتے۔

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

تبدیلئ جنس: لعنت زدہ فعل

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالَ: لَعَنَ النَّبِيُّ ﷺ الْمُخَنَّثِينَ مِنَ الرِّجَالِ، وَالْمُتَرَجِّلاَتِ مِنَ النِّسَاءِ (صحيح البخاري)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی، مردوں میں سے عورتیں بننے والوں پر اور عورتوں میں سے مرد بننے والیوں پر"۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهِينَ بِالنِّسَاءِ مِنَ الرِّجَالِ (سنن الترمذي)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور ان مردوں پر بھی لعنت فرمائی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں"۔

عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: لَعَنَ اللهُ الوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ، وَالْمُتَنَمِّصَاتِ، وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللهِ مَا لِي لاَ أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ (صحيح البخاري)

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے لعنت فرمائی گودنے والیوں پر، گدوانے والیوں پر اور چہرے کے بال اکھیڑنے والیوں پر اور سامنے کے دانتوں میں خوبصورتی کے لیے مصنوعی خلا بنوانے والیوں پر جو اللہ کی تخلیق میں تبدل وتغیر کرتی ہیں اور مجھے کیا ہے کہ میں اُس پر لعنت نہ کروں جس پر اللہ کے نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے"۔

تشریح

پہلی روایت میں وارد لفظ «المُخَنَّثِینَ» کا معنیٰ ہے: ”عورت جیسا بننے والے مرد“ اور «المُتَرَجِّلَاتِ» سے مراد ”مردوں جیسا بننے والی عورتیں“۔ یہاں بننے سے مراد ظاہری حلیے، لباس، آواز و اندازِ گفتگو اور چال ڈھال وغیرہ میں ایک دوسرے کی مشابہت کرنا ہے۔ جیسا کہ دوسری روایت میں ایسے لوگوں کے لیے «المُتَشَبِّهِینَ» اور «اَلْمُتَشَبِّهَاتِ» کے الفاظ آئے ہیں یعنی عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مرد اور مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتیں۔ جنسِ مخالف سے تشبہ اختیار کرنا اتنا برا فعل ہے کہ اس فعلِ بد پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی اور لعنت کا مطلب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محرومی ہے۔

تیسری روایت میں خواتین پر زینت کے بعض مصنوعی طریقوں کے سبب لعنت کی گئی ہے اس روایت کے آخر میں «المُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللهِ» ”اللہ کی تخلیق کو بگاڑنے والیاں“ کے الفاظ سے اس لعنت کی وجہ کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اصل میں زینت کے یہ طریقے اللہ کی تخلیق میں بگاڑ اور تبدل و تغیر کا ذریعہ بنتے ہیں اور اسی وجہ سے ان افعال کے فاعلین پر لعنت کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دو روایات میں مذکور مرد کا عورت جیسا بننے اور عورت کا مرد جیسا بننے پر بھی جو لعنت کی گئی وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ اس میں اللہ کی تخلیق کی مخالفت ہے جو اللہ کی تخلیق میں تبدل و تغیر کا ابتدائی قدم ہے۔

”ٹرانس جینڈر ایکٹ“ جس کی بعض شقوں کے مضمرات میں ”تبدیلیِ جنس“ بھی شامل ہے، کے حوالے سے مندرجہ بالا احادیث میں یہ راہنمائی ہے کہ جب ظاہری امور میں جنسِ مخالف کی تشبیہ اختیار کرنا اس قدر برا کام ہے کہ اللہ کی لعنت کا موجب بنتا ہے تو اندازہ کیجیے کہ کسی مکمل مرد کا محض اپنی choice پر عورت بننا یا بطورِ عورت اپنا اندراج کرانا اور عورتوں جیسے حقوق حاصل کرنا یا کسی مکمل عورت کا محض اپنی پسند کے مطابق جنسِ مخالف اختیار کرنا کس قدر قابلِ لعنت اور قابلِ نفرین کام ہے۔

* * * * *

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۶)

سلطنتِ عثمانیہ اور بیت المقدس

ساتویں صدی ہجری میں قائی نامی ترک قبیلہ منگولوں کی خون ریزی سے بچنے کے لیے ترکمانستان سے نکلا۔ ان کا ایک قافلہ جو چار سو خیموں پر مشتمل تھا، مختلف شہروں سے ہوتا ہوا ایشیاے کوچک کی طرف آنکلا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ قونیہ کے سلجوق حاکم علاؤ الدین کیقباد کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قبیلے کے لیے کوئی جگہ مانگی جائے۔ اثناے سفر انھوں نے سلجوقیوں اور بازنطینیوں کی ایک جنگ کا مشاہدہ کیا جس میں سلجوق شکست کھا رہے تھے۔ قائی قبیلے کے شہسوار اپنے سردار ارطغرل کے حکم پر سلجوقیوں کی مدد کرتے ہوئے جنگ میں کود پڑے جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور سلجوق لشکر کو فتح نصیب ہوئی۔ اس مدد کے صلے میں علاؤ الدین سلجوقی نے قائی قبیلے کو اناطولیہ کے علاقے میں بازنطینی سرحدوں کی طرف آباد کر لیا۔ ارطغرل غازی نے کئی صلیبی علاقے اور قلعے فتح کیے۔ یہاں تک کہ ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ارطغرل کے بیٹے اور جانشین عثمان غازی نے بھی بازنطینی علاقوں کی طرف توسیع کا سلسلہ جاری رکھا جس سے وہ علاؤ الدین سلجوقی کے منظورِ نظر بن گئے۔ ۶۹۹ھ میں منگولوں نے قونیہ فتح کر کے علاؤ الدین سلجوقی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد عثمان کے بیٹے اور خان منگولوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ اس علاقے میں کوئی مضبوط و متحد حکومت نہ تھی اس لیے عثمان خان نے مختلف راجواڑوں کو متحد کر کے عثمانی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ انھوں نے مختلف بازنطینی علاقوں کو فتح کرنا جاری رکھا۔ وہ انھیں قبولِ اسلام، جزیے کی ادائی یا جنگ کی پیش کش کرتے۔ تیسرے عثمانی حاکم اور

خان نے فتوحات کا دائرہ وسیع کیا۔ ان کے دور میں شاہِ روم اندرنیکوس ثالث نے اناطولیہ پر حملہ کیا جس کا کامیابی سے دفاع کیا گیا اور اناطولیہ کے مزید کچھ علاقے فتح ہوئے۔

مراد اول نے بلقان اور بلغاریہ کے کچھ علاقے فتح کیے اور سربیا کو شکست دی جس میں اس کا بادشاہ مقتول ہوا اور اسی جنگ کے اختتام پر مراد شہید بھی ہو گئے۔ ۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں شاہِ ہنگری اور پاپائے روم کی کوششوں سے کئی ملکوں کی اتحادی افواج عثمانیوں پر حملہ آور ہوئیں۔ ان کا نعرہ تھا کہ سحق الأتراك أولا ثم احتلال القدس ''اولاً ترکوں کو تباہ کرو اور پھر قدس پر قبضہ کرو''۔ اس فوج میں ہنگری، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، برطانیہ وغیرہ کی فوجیں شامل تھیں جن کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ صلیبی لشکر دریائے ڈینیوب پار کر کے نیکوپولی پہنچا۔ یہاں سلطان بایزید اول یلدرم کی قیادت میں تعداد نوے ہزار ترک فوج ان کی منتظر تھی۔ یہاں ایک خونریز معرکہ پیش آیا اور عثمانیوں نے فرنگی فوجوں کو شکستِ فاش دی۔ سلطان بایزید یلدرم نے اپنے دورِ حکومت میں متعدّد بار قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی کیا لیکن فتح نہ کر سکے۔ ۸۰۴ھ میں جب تیمور لنگ کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا تو سلطان بایزید، بغداد کے حاکم احمد بن اویس جلائری کو پناہ دینے کی وجہ سے تیمور کے ساتھ جنگ میں الجھ بیٹھے اور ۸۰۴ھ میں اس سے شکست کھائی اور اسی کی قید میں وفات پائی۔ یہ دور عثمانی ریاست کے پہلے زوال کا عرصہ کہلاتا ہے۔ اس میں یورپی مقبوضات اور اناطولیہ کی ریاستیں الگ ہو گئیں۔

کچھ عرصے کے بعد بایزید کے بیٹے محمد اول نے سلطنت کو سنبھالا۔ ان کے بعد سلطان مراد ثانی نے سلطنت کو مضبوط کیا۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں انھوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا لیکن فتح ندارد۔ ۸۲۹ھ/۱۴۲۶ء میں انھوں نے دریائے ڈینیوب کے کنارے ہنگری کو شکست دی اور کچھ علاقے فتح کر لیے۔ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں پاپائے روم اُوجینیوس رابع کی کوششوں سے ایک صلیبی حملہ برپا کیا گیا جس کی قیادت جنرل ہونیادی کے ہاتھوں میں تھی جس نے چند معرکوں میں ترک فوجوں کو شکست دی۔ اب سلطان مراد ثانی خود مقابلے پر آئے اور حملہ آوروں کو مار بھگایا اور سربیا نے عثمانیوں کی اطاعت قبول کی اور ہنگری کے ساتھ امن معاہدہ طے پایا۔ ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء میں پاپائے روم نے اپنے نمائندۂ خصوصی سیزارینی کو ہنگری کی طرف روانہ کیا اور اسے معاہدہ توڑنے اور عثمانیوں کے خلاف جنگ شروع کرنے پر قائل کیا اور کہا کہ مسلمانوں کے ساتھ

معاہدہ توڑنا گناہ یا جرم نہیں بلکہ جائز ہے۔ پوپ کی سازشوں نے فرانس، ہنگری، جرمنی، اٹلی پر مشتمل صلیبی لشکر تشکیل دیا جس نے بلغاریہ کے عثمانی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ سلطان مراد ثانی خود فوج لے کر نکلے اور بلغاریہ کے شہر وارنا کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں عثمانیوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی اور شاہِ ہنگری اور کارڈنیل سیزارینی قتل کیے گئے۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں کوسوو کی طرف ایک اور حملے کا آغاز کیا گیا لیکن صلیبیوں کو ایک بار پھر شکست ہوئی۔

اب سلطان محمد ثانی الفاتح حکمران بنے۔ جنھوں نے حکمران بنتے ہی فتحِ قسطنطنیہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ شاہِ بازنطین، قسطنطین یاز دہم قتل ہوا۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں پرتگالی؛ مسلمان ممالک کو تاراج کرنے کے درپے تھے جب کہ ایران کے شیعہ حکمران اسماعیل صفوی ان کے اتحادی تھے جنھوں نے مصر کی سلطنتِ ممالیک کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سلطان سلیم نے ۹۲۰ھ میں اسماعیل صفوی کو شکست دینے کے بعد ۹۲۲ھ میں ممالیک کو بھی شکست دی۔ انھی کے عہد میں حجاز، مصر، شام اور بیت المقدس عثمانیوں کے زیرِ انتظام آیا، عباسی خلافتِ ثانی کا خاتمہ ہوا اور خلافتِ عثمانیہ وجود میں آئی۔

سلطان سلیم اور سلیمان القانونی کا شمار طاقتور خلفاے عثمانی میں ہوتا ہے۔ ان کے دور میں فتوحات کا دائرہ مزید وسیع ہوا۔ سلطنت تین براعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے علاقوں تک پھیل چکی تھی۔ قبرص، سربیا، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، کوسوو، ہنگری، پولینڈ، البانیہ، یونان، رومانیہ، ویانا سالونیکا، اس کے علاوہ فرانس، جرمنی، اٹلی اور آسٹریا کے کچھ علاقے اس کے علاوہ فلسطین، شام، حجاز، عراق، مصر، ایری ٹیریا، لیبیا، الجزائر وغیرہ خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ سایہ آ چکے تھے۔

عثمانی سلطنت کا زوال

سلطنتِ عثمانیہ کو، سترہویں صدی عیسوی میں بہت سارے خارجی و داخلی انتشارات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۶۸۴ء میں پاپاے روم کی کوششوں سے یورپی طاقتوں مثلاً آسٹریا، اٹلی، روس، بولونیا وغیرہ نے ترکی کے خلاف ایک جنگی اتحاد تشکیل دیا۔ جنگوں کا یہ سلسلہ ۱۶۹۹ء تک چلا جب ترکوں کو شکست ہوئی اور فرانس کی کوششوں سے ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے عثمانیوں کو بہت سارے یورپی مقبوضات سے ہاتھ دھونے پڑے۔ معاہدہ کارلو وٹس (Treaty of Karlowitz)

یورپ میں عثمانی انحطاط کی ابتدا کہلاتا ہے۔ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں معرکۂ پٹروفاراڈین (Battle of Petrovaradin) میں ترکوں کو آسٹریا کے ہاتھوں سخت شکست ہوئی جس میں ان کے عظیم جرنیل محمد علی پاشا کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس جنگ کے بعد ایک معاہدے کی رو سے ترکوں کو سربیا، بلغراد اور ولاشیا کے علاقوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کچھ عرصے بعد مصر، شام اور لبنان میں مقامی لوگوں نے ترکوں سے علیحدگی کی تحریکیں چلائیں۔ ان کی سرپرستی روس اور اٹلی وغیرہ کرتے تھے۔ ترکوں کو ان بغاوتوں کے ناکام بنانے میں بڑی محنت، وسائل اور کثیر سرمایہ صرف کرنا پڑا۔ روس کے ساتھ عثمانیوں کی کئی جنگیں ہوئیں۔ بعض دفعہ عثمانیوں کو فتح نصیب ہوتی رہی لیکن اکثر میں روسیوں کا پلہ بھاری رہا۔ ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں روس نے سلطنتِ عثمانیہ کو سخت ہزیمت سے دوچار کیا۔ جنگ کا اختتام معاہدۂ کینارجہ (Kuchuk Kainarjæ) پر ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے ترکوں کو کریمن سے محروم ہونا پڑا، رومانیہ کے بعض علاقوں کو عثمانی سلطنت کے ماتحت آزاد حیثیت دی گئی اور روس کو ان ممالک کے سیاسی معاملات میں حقِ دخل اندازی دیا گیا۔ نیز روس کو سلطنتِ عثمانیہ کی عیسائی رعایا کے نگران و محافظ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور تاریخ میں پہلی بار ترکی کو تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑا۔

سولہویں صدی عیسوی میں شام کے علاقے میں مختلف بغاوتیں ابھرتی رہیں۔ فخر الدین المعني اور اس کے بعد بشیر الشهابي اور ظاہر العمر وغیرہ نے لبنان، سوریا اور فلسطین کے اکثر علاقوں پر خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ بعد میں احمد الجزار نے بعض علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی جو عثمانیوں کا ماتحت تھا۔ ۱۲۱۶ھ/۱۷۹۸ء میں فرانس کے جرنیل نپولین بوناپارٹ نے مصر اور شام پر حملہ کیا اور بہت سارے شہروں کو تاراج کرنے کے بعد طاعون کی وبا اور ابوقیر کے سمندری معرکے میں انگریزی فوجوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں یونانیوں نے بغاوت کی جو یورپ کی حمایت سے کامیاب ہوئی اور ترکوں کو یونان سے دستبردار ہونا پڑا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے آخری عشروں میں تیونس، سوڈان، اریٹیریا اور صومالیہ بھی ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں شیخ محمد بن عبد الوہاب اور نجد کے علاقے درعیہ کے امیر محمد بن سعود کے درمیان سلفی دعوت کے فروغ اور اس کی بنیاد پر ریاست کے قیام کا معاہدہ ہوا اور آہستہ آہستہ امارتِ درعیہ نے نجد کے دوسرے علاقوں کی طرف وسعت اختیار کی۔ عثمانیوں کے حکم پر والیٔ مصر محمد

علی پاشااوران کے بیٹے ابراہیم نے ان کی سرکوبی کی اور آخر کار ۱۸۱۸ء میں ان کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود نے سعودی سلطنت کا دوبارہ احیا کیا جس نے عثمانیوں کو اپنے علاقوں سے نکال دیا لیکن حائل کی امارت آلِ رشید نے ان سے ریاض وغیرہ چھین لیے۔ ۱۹۰۲ء میں عبد العزیز بن سعود نے آلِ رشید کو شکست دی اور اس طرح نجد اور قریبی علاقوں پر سعودیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ پے در پے جنگوں کی وجہ سے ترکی کی معیشت بہت کمزور ہو چکی تھی اور ملک کئی ملین کا مقروض تھا۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں ترک قومیت اور سیکیولر دعوت کو فروغ ملنا شروع ہوا اور جوانانِ ترک تنظیم اور اس کے اتحاد و ترقی عسکری ونگ کا آغاز ہوا۔ ان حالات میں آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی بن عبد المجید ۱۲۹۳-۱۳۲۷ھ/۱۸۷۶-۱۹۰۹ء نے حکومت سنبھالی۔

جاری ہے

* * * * *

فرید بن مسعود
معاون قلم کار

صنفی شناخت کی پالیٹیکل اکانومی

اگر آپ مارکیٹ میں کپڑا بیچنے نکلیں اور خریدار محض ایک یا دو قسم کے ہی کپڑے پہنتے ہوں تو آپ کا کپڑا ایک حد سے زیادہ نہیں بکے گا۔ فرض کریں اگر آپ کی مارکیٹ میں سارے خریدار دعوتِ اسلامی کے کارکنان ہوں، اور آج سے کوئی دس سال پہلے کی دعوتِ اسلامی ہو اور آپ کے خریدار صرف ایک خاص قسم کا سفید کرتا پاجامہ اور سبز عمامہ پہنتے ہوں تو آپ کی دکان پر کوئی خاص بکری نہیں ہوگی۔ اگر یہ اصول بہت ہی سادہ سی مثال سے واضح ہوتا ہے تو اصولی بات یہ ہے کہ معاشرے میں کسی قسم کی طے شدہ درجہ بندی (stratification)؛ تنوع (diversity) کے امکانات کم کر دیتی ہے۔ تنوع کی کمی جدید مارکیٹ کے سرمایہ دارانہ اہداف سے متصادم ہے۔ اس کا ایک ثبوت مردوں اور عورتوں کے کنزیومر ڈیٹا کا فرق ہے جس کے مطابق خواتین کپڑوں پر مردوں سے زیادہ خرچ کرتی ہیں کیونکہ خواتین کے لباس میں مردوں کی نسبت بہت زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ اب ذرا جدید مارکیٹ کی وسعت کو ذہن میں لائیں جس میں خود آپ بھی ایک جنسِ قابلِ فروخت ہیں اور آپ کا سوشل میڈیا کا استعمالی ڈیٹا بھی ایک کاموڈٹی ہے۔ ایسے میں سرمائے کی ہموار روانی کے لیے کس قدر وسیع تنوع درکار ہوگا۔ ایک اچھا سرمایہ دارانہ نظام کبھی آپ کے ثقافتی، مذہبی یا قومی مظاہر کے خلاف نہیں کھڑا ہوگا، اس بے اعتنائی سے آپ کو رواداری کا شبہہ ہونے لگے گا۔ اصلاً سرمایہ داری روادار نہیں بلکہ تنوع کی پرچارک ہے۔ مذہبی، قومی یا ثقافتی شناختیں مارکیٹ میں انسانی اظہار کے ممکنات میں اضافے کا ذریعہ بنتی ہیں، البتہ صرف ایک مذہب، ایک ثقافت اور ایک قوم ہو تو یہ ممکنات کی فہرست میں محدودیت لے آتے ہیں۔ اس لیے آپ کو اچھے سرمایادارانہ معاشروں میں ملٹی کلچرل ازم، بین الاقوامی مقابلے نظر آئیں گے اور ہر شخص ہر قسم کے

مذہبی تہواروں کو مناتا نظر آئے گا۔اس تنوع کے پیچھے سرمایہ داری کی اصل قدر ’’آزادی‘‘ کار فرما ہے۔یہ بات بہت باریک ہے اور اس میں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام مذہبی تقسیم کو اون نہیں کرتا، مذہبی تنوع کو سیلیبریٹ کرتا ہے۔اگر آپ سرمایہ دارانہ نظام کے کسی حامی پر اعتراض کریں کہ کیا تم مذہبی تقسیم کے قائل ہو؟ تو فوراً جواب آئے گا کہ ارے نہیں ہمارے لیے تو مذہب بے معنی سی چیز ہے، ہاں البتہ مذہبی تہوار، انسان دوستی، محبت وغیرہ کو ہم سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کی کمیونسٹ تنقید میں یہ بات آپ کو صاف نظر آئے گی کہ مذہبی، ثقافتی اور قومی شناختیں سرمایہ دار طبقے کا اپنا تسلط قائم رکھنے کا بہانہ ہے اور اس شناخت پر مبنی تقسیم سے وہ معاشرے کی اصل استحصالی تقسیم یعنی بورژوا اور پرولتاریہ (یعنی سرمایہ دار اور مزدور) پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔اس لحاظ سے اشتراکیوں نے ہمیشہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک اصولی موقف اپنائے رکھا اور آزادی کے نام پر اس طبقے کے بنائے ہوئے دجل کو واضح کرتے رہے۔اسی لیے اشتراکی بظاہر لبرل سرمایہ داروں کے مقابلے میں مذہب کے زیادہ مخالف بھی نظر آتے ہیں۔

ابتدائی دور میں سرمایہ دارانہ معاشرے نے مرد اور عورت کے فرق کو بھی کافی ’’سیلیبریٹ‘‘ کیا اور اس بنیاد پر مارکیٹ میں سرمایہ کمایا گیا۔آپ ’ بیٹی فرائڈن ‘ کی کتاب ’فیمینن مسٹیک ‘ پڑھیں تو وہ جس امریکی سرمایہ دارانہ معاشرے کا نقشہ کھینچتی ہے، ایسا اشتباہ ہونے لگتا ہے کہ جینڈر اور فیملی کے لحاظ سے یہ شاید زمانہ قبل از جدیدیت کا کوئی روایتی معاشرہ ہے۔اس کے برعکس اشتراکی شروع دن سے ہی جینڈر کے فرق کے خلاف تھے اور انتہائی مساوات کے قائل۔ فیمینزم کی تیسری لہر کے بعد جب سرمایہ دارانہ معاشروں میں جینڈر بائنری [1] اور پدر سری فیملی پر تنقید ہونا شروع ہوئی تو سرمایہ داری نے کمال ہوشیاری سے جینڈر اور فیملی کے تصور کو بھی اتنا ہی بے معنی بنا دیا جتنا مذہب، ثقافت اور قومی شناخت بن چکی تھی۔

ہمارے یہاں جینڈر پر بحث کا آغاز ٹرانس جینڈر بل کے تناظر میں ہوا اور اس ضمن میں پورا زور صرف اس بات پر لگایا گیا کہ اس بل سے ہم جنس پرستی بڑھ جائے گی۔ ٹرانس جینڈر بل میں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس سے ہم جنس پرستی بڑھ جائے گی۔۔۔ وہ تو اس بل کے بغیر ہی بڑھ چکی ہے۔۔۔ مسئلہ یہ ہے کہ عسکری، سیاسی، فکری، علمی اور معاشی محاذوں کی شکست و ریخت کے بعد ایک واحد مورچہ روایتی فیملی بچا ہوا تھا جس میں رواجی انداز میں دین کے کچھ آثار قائم تھے، ہم عنقریب وہ بھی کھو

دیں گے۔ فیمینزم کی تیسری لہر نہ مرد وزن کی مساوات کی بات کرتی ہے، نہ خواتین کے حقوق کی اور نہ ہی خواتین کے مردوں سے مخاصمانہ مقابلے کی۔ یہ جنس کی ہر قسم کی مذہبی، ثقافتی اور یہاں تک کہ طبیعی بنیادوں کی نفی پر قائم ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شخصی پسند کی بنیاد پر اگر جنس کا تعین ہونے لگے تو خاندان وجود میں نہیں آئیں گے یا بچے پیدا نہیں ہوں گے۔ ہاں ایسا ضرور ہوگا کہ جو خاندان بنے گا اس میں افراد ایک ایسے صارفانہ تعلق (consumer relationship) سے جڑے ہوں گے جو خالصتاً افادی ہوگا اور اولاد ایک کموڈٹی بن جائے گی جس کے لیے سرمایہ کاری کی جائے گی۔ یہ کوئی سائنس فکشن نہیں بلکہ ہم جنس پرست خاندانوں میں سروگیسی[۲] سے پیدا ہونے والے بچوں کو ہی دیکھ لیں۔ اس بازاری فیملی میں سرمائے میں اضافے کی اقدار تو رسوم کی شکل لے سکتی ہیں دین کی کوئی رمق البتہ کسی رسم کی صورت بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ فیمینزم کی تیسری لہر سے اشتراکی فکر بھی نبرد آزما نہیں ہو پائی ہے۔ حکومتی سطح پر جہاں اشتراکی لوگ غالب ہیں یا تھے (مثلاً چین یا روس)، ان ملکوں میں تو اس تیسری لہر کی سیاسی سطح پر کھل کر مخالفت کی گئی ہے البتہ دنیا بھر میں اشتراکی فکر رکھنے والے لوگ اس ضمن میں جینڈر کے اسی موقف پر کھڑے ہیں جہاں لبرل سرمایہ دار کھڑے ہیں۔ یعنی مزید خطرے کی بات یہ ہے کہ نہ تو ہم خود اس یلغار کے خلاف کوئی ہتھیار رکھتے ہیں نہ ہی کہیں اور سے ہتھیار برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

حواشی

(۱) جنسی ثنویت یعنی جنس کو صرف دو کیٹیگریز میں دیکھنا یعنی صرف مرد یا عورت

(۲) وہ جوڑے جو اولاد کے خواہشمند ہوں لیکن حمل کے مراحل سے بچنا چاہیں، اس جوڑے کے مرد کا مادہِ منویہ اور عورت کا بیضہ لے کر لیبارٹری میں اس کا جنین بنایا جاتا ہے اور پھر کسی دوسری عورت کا رحم کرائے پر لے کر سائنسی عمل کے ذریعے اس جنین کو اس عورت کے رحم میں رکھوا دیتے ہیں، اور مدتِ حمل گزرنے پر بچہ لے لیتے ہیں، جبکہ اس Surrogate Mother کو رحم استعمال کرنے کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ عموماً معاشی طور پر مجبور خواتین اپنا رحم سروگیسی کے لیے پیش کرتی ہیں۔

*****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۹)

آخری قسط

استنبول کی بلدیہ فاتح میں ایک مسجد ”اسماعیل آغا جامی“ کے نام سے معروف ہے جو خلافتِ عثمانیہ کے ایک شیخ الاسلام حضرت اسماعیل آغا آفندی رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب ہے جبکہ اس محلے کا نام ”چار شنبہ“ ہے۔ اور اس مسجد سے وابستہ صوفی اصلاحی جماعت کو اسماعیل آغا جماعت کہتے ہیں۔ اسماعیل آغا کا علاقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے کراچی میں مدنی مسجد کے ارد گرد کا ماحول ہے۔ ہر طرف عمامے اور داڑھی والے لوگ نظر آتے ہیں۔ کتابوں، ٹوپیوں اور دیگر مذہبی مصنوعات کی دکانیں ہیں۔ اسماعیل آغا جماعت ایک ترک صوفی جماعت ہے جو سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہے۔ اسماعیل آغا مسجد میں اس سلسلے کے بیانات ہوتے ہیں۔ اس جماعت سے وابستہ افراد کا خاص حلیہ ہوتا ہے جو ان کی انفرادی شناخت بھی ہے۔ انھیں پورے ترکی کے دین دار حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مسجد سے کچھ ہی فاصلے پر ان کے زیرِ انتظام ایک شان دار مدرسہ بھی حالاً قائم ہوا ہے جہاں انتہائی معیاری انتظامات اور بہترین تعلیمی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی جماعت سے وابستہ ایک میزبان ہمیں مدرسے کے اندر لے گئے اور مختصر دورہ کروایا۔ مدرسے کے دورے کے بعد ہمارے میزبان ہمیں مدرسے کی نچلی منزل میں لے گئے جہاں ایک بہت خوب صورت دروازہ لگا ہوا تھا۔ انھوں نے اسے کھولا تو اندر شادی ہال بنا ہوا تھا۔ بتایا گیا کہ جماعت سے وابستہ افراد کے لیے یہیں شادی کی تقریب منعقد کی جاتی ہے تاکہ دیگر مفاسد سے بچا جا سکے۔ اسماعیل آغا جماعت کا تعارف ہو اور شیخ محمود آفندی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہ ہو تو بات نامکمل رہ جاتی ہے۔

اسماعیل آغا جماعت دراصل شیخ محمود آفندی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ شیخ کا خاندانی نام تو "اوستاؤسَمان اوغلو" (بعض لوگ اسے استاد عثمان اوغلو بھی پڑھتے ہیں) تھا لیکن شہرت محمود آفندی کے نام سے ہوئی۔ شیخ محمود آفندی ۱۹۲۹ء میں ترابزون میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں کے علما سے حاصل کی۔ شیخ نے جب دینی تعلیم کی تحصیل شروع کی تو ریاست کی طرف سے دینی شعائر پر سخت پابندی تھی۔ بالخصوص عربی زبان اور علومِ اسلامیہ کی تحصیل بالکل ممنوع تھی۔ شیخ نے چھپتے چھپاتے اور سرکاری اہل کاروں کی نظروں سے بچتے ہوئے دینی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۵۴ء میں استنبول میں اسماعیل آغا مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جب شیخ نے دیکھا کہ لوگ مسجد نہیں آتے اور لوگوں کے لیے نماز پڑھنا اور دیگر اسلامی شعائر اختیار کرنا ممنوع ہے تو لوگوں سے ربط ضبط بڑھانے کے لیے انھوں نے اہلِ محلہ کے گھروں پر جانا شروع کیا۔ دروازے بجاتے اور کہتے کہ کوئی کام ہو تو بتادیں۔ کبھی سودا سلف لا کر دیتے کبھی اور کوئی تعاون کرتے۔ اس طرح لوگ آپ سے مانوس ہونے لگے اور دنیاوی کے ساتھ ساتھ دینی مسائل میں بھی آپ سے رہنمائی حاصل کرنے لگے، حتی آپ کے متعلقین کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ترکی میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا کردار بہت اہم اور ناقابلِ فراموش ہے۔ شیخ رواں برس ۲۳ جون کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ۲۴ جون کو فاتح مسجد میں شیخ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

شیخ محمود آفندی کی وفات سے ترکی کے علمی و اصلاحی حلقے ایک عظیم اور مشفق سرپرست سے محروم ہو گئے لیکن شیخ اپنے بعد بے شمار علما اور مبلغین تیار کر گئے جو ترکی کے کونے کونے میں اسلامی روایات کے احیا کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ تھا اسماعیل آغا جماعت اور شیخ محمود آفندی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف۔ اب ہم واپس چلتے ہیں چار شنبہ کے محلے میں اور اس گلی کا جائزہ لیتے ہیں جہاں سے یہ عظیم سلسلہ شروع ہوا اور پورے ترکی میں پھیل گیا، بقولِ شاعر:

"ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی"

نمازِ ظہر میں کچھ وقت باقی تھا اس لیے مختلف دکانوں سے خریداری شروع کر دی۔ جماعت کا وقت ہوا تو پورا بازار رضاکارانہ طور پر بند ہو گیا اور سب مسجد میں جا پہنچے اور نماز ادا کی۔ اسماعیل آغا مسجد اگرچہ بہت بڑی نہیں ہے لیکن بہت خوب صورت بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد ابتداءً ۱۷۲۳ء میں تعمیر کی گئی۔ ۱۸۹۴ء کے زبردست زلزلے میں اس مسجد کی تعمیر کو

کافی نقصان پہنچا۔ مسجد کی تعمیرِ نو اور تزئین و آرائش کا کام ۱۹۵۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کے ٹھیک دو سال بعد شیخ محمود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انتظام سنبھال لیا اور ۱۹۹۶ء تک امامت کی ذمے داری نبھائی۔ ہم مسجد اور مدرسے کے دورے سے فارغ ہوئے تو واپس قیام گاہ روانہ ہوگئے اور ان نورانی اور روحانی مقامات کی یادیں اپنے ساتھ لے آئے۔ دوپہر کا وقت تھا اور ناشتہ فجر کے فوراً بعد کیا تھا اس لیے قریب ہی ایک ہوٹل میں کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ کھانا کھا کر باہر نکلے تو مشورہ ہوا کہ کچھ دیر بازار میں گھوم پھر کر نمازِ عصر فاتح مسجد میں ادا کریں گے۔ نمازِ عصر سے ذرا قبل فاتح مسجد سے متّصل ایک قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔ قہوہ خانے کا منظر، قہوے کی پیالیاں، نشستیں اور قہوے کی پیشکش الغرض سب کچھ ہی اتنا دلکش اور نفیس ہے کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں اور کیفیت یہ ہے کہ الفاظ تخیل کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ اور پھر قہوہ پیتے ہوئے پس منظر میں فاتح مسجد کا مینار ہو اور سماعتیں فاتح مسجد کی اذان سے لطف اندوز ہوں تو یوں جی چاہتا ہے کہ نہ یہ اذان کبھی ختم ہو اور نہ ہی یہ پیالی کبھی خالی ہو، بقولِ غالبؔ:

"رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے"

تاکہ

"بیٹھیں رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے"

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے گو تلخ ہی سہی کہ دنیا کا پیمانہ کبھی نہ کبھی تو خالی ہو ہی جائے گا۔ ہمارے قارئین بھی آخری قسط پڑھتے ہوئے یہ کہہ اٹھیں گے کہ بارہا چائے اور قہوے کا ذکر ہو چکا اور ہر بار بقولِ فرازؔ:

"اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا"

مگر کیا کریں،

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

اور پھر، صرف ہم ہی نہیں ہندوستان کے جو لوگ بھی استنبول گئے انھیں استنبول کے قہوہ خانوں نے اپنے سحر میں ایسا جکڑ لیا کہ یہ طِلسم عمر بھر نہ ٹوٹ سکا۔ علامہ شبلی نعمانی نے تو یہاں کے قہوہ خانوں کے مناظر ایسے دلکش انداز میں بیان کیے ہیں کہ ہم

حسرت سے اس زمانے کو یاد کرتے ہیں اور قہوے کے اٹھتے ہوئے دھنویں میں ان مناظر کے نقوش بزورِ تخیل تراش کر مٹا دیتے ہیں۔ انھی مناظر کے سحر میں گرفتار تھے کہ اقامت کی آواز آئی، ہم نے فوراً مسجد کا رخ کیا اور نماز میں شامل ہو گئے۔ سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت اور مسجد کی نورانیت۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ یہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا لیکن:

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

کل کراچی کے لیے روانگی ہے اس لیے ارادہ ہوا کہ اہلِ کراچی کے لیے استنبول کی سوغات لیتے جائیں، چنانچہ فاتح مسجد سے متّصل مالٹا بازار سے زیتون اور مٹھائی خریدی اور رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ بھی زیتون کا تیل خریدنا چاہیں وہ فاتح مسجد سے متّصل بازار میں موجود ایک وقف ادرے سے خریداری کریں جہاں سامان خالص بھی ہے اور قیمت میں کم بھی ہے۔

نمازِ مغرب رہائش گاہ میں ادا کی۔ آج منصوبہ تھا میٹرو ٹرین میں سفر کا اور استقلال اسٹریٹ کے دورے کا۔ لہٰذا ہمارے استاد اور انتہائی ملن سار میزبان جناب مفتی احمد رضا صاحب کی معیت میں اس ارادے کی تکمیل کے لیے روانگی ہوئی۔ مفتی صاحب چونکہ ترکی میں ہی مقیم ہیں اس لیے ترکی زبان سے واقف ہیں اور ترکی کی تاریخ کا گہرا مطالعہ بھی رکھتے ہیں لہٰذا ہم تمام مقامات پر ان کے مطالعے سے استفادہ کرتے رہے۔ سب سے پہلے میٹرو ٹرین میں سوار ہوئے اور مفتی صاحب کے ساتھ سِرکیجی ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ یہ وہ ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے کبھی حجاز کے لیے سلطان عبد الحمید ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ریل گاڑی کا اجرا کیا تھا۔ اسی طرح یہاں سے کچھ عرصہ قبل تک جرمنی کے لیے بھی ٹرین جاتی تھی۔ اس اسٹیشن کے دورے کے بعد ہم مرمرائے (ایک ٹرین سروس کا نام ہے) میں سوار ہوئے جو سمندر کے اندر سفر کرتی ہے اور ایشیا کو یورپ سے ملاتی ہے۔ یہ ٹرین ایک سرنگ سے گزرتی ہے جو آبنائے باسفورس کے پانیوں میں بنائی گئی ہے۔ یہ سرنگ تقریباً ساڑھے تیرہ کلومیٹر لمبی ہے جو یَینی کاپے اور اُسکودار کے درمیان ہے۔ یہ سفر پورا ہوا تو ہم نے گلاٹا ٹاور کا رخ کیا۔

گلاٹا ٹاور دراصل ساحلِ سمندر پر واقع ایک واچ ٹاور تھا جسے پہلی بار ۱۳۴۸ء میں رومی دور میں تعمیر کیا گیا۔ یہ اس وقت قسطنطنیہ کی سب سے اونچی عمارت تھی جس کی بلندی تقریباً ۲۲۰ فٹ تھی۔ اسے قسطنطنیہ کی علامت سمجھا جاتا تھا اور

بحری جہازوں کو سَمت بتانے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے قید خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک مشہور قصہ بھی ہے کہ ایک سائنس دان ''حِذرافِن احمد چلبی'' نے دونوں کندھوں کے ساتھ پَر باندھ کر ٹاور سے کود کر پرواز کی لیکن قریب ہی ایک مقام پر گر گیا۔ بہر حال، اب گلاٹا ٹاور ایک سیاحتی مقام ہے۔ ٹاور کے ساتھ پرانے طرز کی ایک ٹرام کھڑی ہے جس سے ٹاور میں داخلے کا ٹکٹ ملتا ہے۔ ٹاور گھومنے کا ضابطہ یہ ہے کہ پہلے لفٹ میں سب سے اوپر والی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایک شاندار نقشہ (ماڈل) استنبول کا رکھا ہوا ہے۔ اس نقشے میں استنبول کی تمام مساجد موجود ہیں اور ان پر ایک بلب لگا ہوا ہے۔ یہ نظام ایک اسکرین سے منسلک ہے جس پر تمام مساجد کے نام ہیں۔ آپ اسکرین پر جس مسجد کا بٹن دباتے ہیں۔ نقشے میں وہ مسجد روشن ہو جاتی ہے۔ اور نقشہ بھی ایسا حقیقی اور خوبصورت ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس نقشے والے کمرے کی بالائی منزل میں چار یا پانچ دروازے ہیں جو ٹاور کے کھلے حصے تک لے جاتے ہیں۔ ہر دروازے پر بڑی آہنی دوربینیں نصب ہیں جو بہت دور تک کا منظر دکھاتی ہیں۔ اب چلتے ہیں بیرونی حصے کی طرف، ٹاور کے کھلے حصے سے پورے استنبول کا منظر نہایت شاندار نظر آتا ہے۔ استنبول جانے والے اکثر لوگ خلیج اور آبنائے باسفورس کے فرق میں الجھے رہتے ہیں۔ اگر گلاٹا ٹاور سے دونوں کو ایک بار دیکھ لیا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔ آبنائے باسفورس سمندر کا حصہ ہے جو ایشیا اور یورپ کے درمیان ہے جبکہ خلیج استنبول کے یورپی حصے میں ایک ندی یا نہر کی طرح ہے جس کے ایک طرف گلاٹا اور دوسری طرف ''ایمی نونو'' ہے (جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے)۔ یہاں کچھ دیر نظارہ کرنے اور تمام بڑی مساجد کا تعین کرنے کے بعد نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ آمد لفٹ سے ہوتی ہے، واپسی کے لیے زینہ بنا ہوا ہے جس کی ہر منزل پر آثارِ قدیمہ کی دو چار چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ سیڑھیاں خود آثارِ قدیمہ کا جزو معلوم ہوتی ہیں۔ ایک منزل پر بہت موٹی اور بڑی زنجیر رکھی ہوئی تھی، بتایا گیا کہ یہ اس زنجیر کا ٹکڑا ہے جو بازنطینیوں نے قسطنطنیہ کے داخلی بحری راستے پر لگائی تھی۔

اس سے نچلی منزل پر پہنچے تو ایک اسکرین کے آگے لوگ کھڑے ہوئے نظر آئے اور اسکرین پر گلاٹا ٹاور کا منظر تھا جہاں ایک شخص کنارے پر کھڑا تھا اور اڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کے دونوں کندھوں کے ساتھ پر بندھے ہوئے تھے۔ اسکرین کے بالکل سامنے زمین پر ایک نشان بنا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے ہمیں وہاں دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہونے کا

اشارہ کیا۔ جیسے ہی ہم نے نشان پر پہنچ کر بازو پھیلائے وہ پروں والا شخص کود گیا اور اڑنے لگا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ ایک کھیل ہے۔ اس کھیل کی صورت یہ ہے کہ اسکرین پر ایک شخص کی وڈیو نظر آتی ہے اور اسکرین میں سینسر لگے ہوئے ہیں، جب کوئی شخص اسکرین کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسکرین میں خود کار طور پر وہ آدمی اڑتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کا تعلق اسکرین کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے ساتھ ہوتا ہے، جدھر یہ آدمی ہاتھ موڑتا ہے وہیں اسکرین میں نظر آنے والا آدمی بھی مڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھیل ہے، حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، اگر حقیقی اڑان ہوتی تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔ بہر حال، ہم جس طرف ہاتھ موڑتے تھے وہ شخص بھی اسی طرف مڑتا تھا۔ کبھی اوپر کبھی نیچے اور کبھی دائیں بائیں۔ لیکن ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ جس اڑنے والے شخص سے یہ واقعہ منسوب ہے وہ ایک جگہ گر گیا تھا، لٰہذا یہ اسکرین والا شخص بھی استنبول کی آبادی پر اڑتا ہوا تب آپ کے اختیار سے نکل جاتا ہے جب اسے گرنا ہوتا ہے۔ ہم نے خوب جتن کیے کہ اس شاہین کی پرواز میں کوتاہی نہ ہو اور یہ ہمارے قابو میں رہے لیکن ہمارا شاہین گرتا ہی چلا گیا۔

بہر حال، اس عارضی پرواز کو زمین بوس کرنے کے بعد ہم گلاٹا سے نکل آئے اور استقلال اسٹریٹ کی طرف بڑھے۔ راستے میں ایک جگہ پٹری بنی ہوئی نظر آئی۔ یہاں سیاحوں کے لیے ایک ٹرام چلتی ہے جو انھیں بازار کا چکر لگواتی ہے۔ استقلال اسٹریٹ کیا ہے یہ ہم آپ کو ضرور بتائیں گے لیکن ہمیں ہوٹل نظر آ گیا ہے۔ لٰہذا یہاں ہم کچھ دیر کھانے کے لیے رکیں گے پھر ”آگے چلیں گے دم لے کر“۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو پا پیادہ ہی استقلال اسٹریٹ کی طرف بڑھے۔ اسقلال اسٹریٹ یا استقلال ایوینیو جسے ترکی زبان میں ”استقلال جدیسی“ بھی کہتے ہیں دنیا کے مشہور ترین سیاحتی مقامات میں سے ایک ہے جہاں یومیہ لاکھوں لوگ آتے ہیں۔ تقریباً چودہ سو میٹر لمبی اس گلی میں دنیا کے بڑے اور مشہور برینڈ، ہوٹل، کیفے، کلب اور نجانے عیاشی کے کیا کچھ سامان دستیاب ہیں۔ العیاذ باللہ! اس گلی کو اسقلال کا نام ۱۹۲۳ء میں خلافت کے خاتمے اور جمہوریت کے آغاز پر دیا گیا اور اسے آزادی سے منسوب کیا گیا۔ جیسی نسبت ویسا کام۔ گلاٹا سے شروع ہو کر یہ سڑک تقسیم اسکوائر پر ختم ہوتی ہے جہاں ”ترکِ ناداں“، مصطفی کمال اتاترک کا مجسمہ نصب ہے۔ اس نام میں نہ کوئی کمال ہے نہ اسے ”اتاترک“ یعنی بابائے ترک

کا لقب زیب دیتا ہے۔ اس نااہل، نالائق اور نادان ترک نے جہاں خلافت کی قبا کو چاک کیا وہیں سامانِ رفو کو نذرِ آتش کر کے رفوگروں کو بھی پابندِ سلاسل کر دیا۔ وہ قبا جس نے تیرہ سو سال مسلمانوں کو زینت بخشی، مصطفی کمال کے ہاتھوں تار تار ہو کر بھولی بِسری یاد بن گئی:

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

آج حسرت سے خلافتِ عثمانیہ اور اس زمانے کی رونقوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ بہر حال، خلافت کی یاد بھی ایک غنیمت ہے کہ عظمتِ رفتہ کا ذکر حوصلہ افزائی کا ذریعہ اور روشن مستقبل کی امید کا باعث ہے:

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سرو ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

استنبول میں جو سیاح آتے ہیں استقلال میں قیام کرتے ہیں، ایسے افراد کی زبانوں پر استنبول کے سیاحتی مقامات میں لے دے کر استقلال اور تقسیم اسکوائر ہی کا ذکر آتا ہے۔ اگر سیاحت؛ عیاشی، بے حیائی اور بے غیرتی کا نام ہے تو یقیناً سیاحتی مقامات یہی دو ہیں۔ ورنہ استنبول کی زینت تو سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار شریف ہے۔ سلطان محمد فاتح کی مسجد اور مقبرہ ہے۔ آیا صوفیہ اور بازنطینیوں کی شکست و ریخت کی علامت دیوارِ قسطنطنیہ ہے۔

اس طویل سڑک سے گزر کر دوسری طرف پہنچے جہاں تقسیم اسکوائر واقع ہے۔ تقسیم اسکوائر ۱۹۲۸ء میں جمہوریہ ترکی کی پانچویں سال گرہ کی یاد میں تعمیر کیا گیا اور اب جدید استنبول کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ خلافتِ عثمانیہ کی پانچویں برسی پر دشمنانِ اسلام کے جشن کی علامت ہے۔ لیکن اس اسکوائر کے بالکل سامنے موجودہ ترک حکومت نے ایک انتہائی عمدہ اقدام کیا ہے۔ استقلال اسٹریٹ جیسے ہی ختم ہوتی ہے سامنے تقسیم مسجد کا انتہائی خوبصورت گنبد نظر آتا ہے۔ یہ مسجد اندر سے بھی بہت شاندار بنی ہوئی ہے۔ استقلال اسٹریٹ سے گزر کر آنے والے سیاحوں کے لیے یہ ایک پیغام ہے کہ عیاشی کا دور گزر چکا۔ اب ایک نئی صبح طلوع ہوگی جس کی علامت یہ مسجد ہے۔ اس لمبی گلی سے گزرتے ہوئے اور نئی تہذیب کے گندے انڈوں کو تاکتے ہوئے آپ حسرت کے ساتھ فیض کا آدھا مصرع پڑھ سکتے ہیں کہ ”لمبی ہے غم کی شام“

لیکن اختتام پر تقسیم مسجد کو دیکھتے ہی امیدیں لوٹ آتی ہیں اور مصرع مکمل ہو جاتا ہے کہ ''شام ہی تو ہے''۔ لیکن استنبول میں شام نہیں رات ہو چکی اور بقول انشاؔ جی:

''شب بیتی، چاند بھی ڈوب چلا، زنجیر پڑی دروازے پر''

لہٰذا ہمیں بھی اب چلنا چاہیے۔ قریب کے ایک بس اڈے سے بس میں سوار ہوئے اور رہائش گاہ پہنچ کر لمبی تان لی۔ صبح ہوئی تو ایک ساتھی کے ساتھ منصوبہ بنایا کہ آج استنبول میں آخری صبح ہے، نمازِ فجر مہرماہ مسجد میں ادا کرنی چاہیے، لہٰذا ہم دونوں روانہ ہوگئے اور نمازِ فجر مہرماہ مسجد میں ادا کی (اس مسجد کا تعارف پہلی قسط میں گزر چکا ہے)۔ نماز کے بعد مفتی احمد رضا صاحب کے ساتھ ناشتہ کیا اور سامان باندھنے لگے کیونکہ آج شام کراچی کی طرف روانگی تھی۔ جو منصوبہ ہم نے استنبول میں سیر و سیاحت کا تیار کیا تھا اس میں اب صرف دو مقامات باقی رہ گئے تھے: ایک سلیمانیہ مسجد اور دوسرے توپ کاپی میوزیم جہاں ہم ایک بار جا چکے تھے لیکن مرمتی امور کے سبب یہ میوزیم بند تھا۔ توپ کاپی کو دیکھنا تو اتنے کم وقت میں ممکن نہیں تھا اس لیے سلیمانیہ مسجد کا قصد کیا۔ مفتی احمد رضا صاحب کی معیت میں روانگی ہوئی۔ پہلے پہل مفتی صاحب ایک بازار میں لے گئے جہاں اردو بازار کی طرح کتابوں کی دکانیں تھیں۔ اس کے بعد کسی عثمانی تحقیقی ادارے کا دورہ کروایا جہاں ایک ترک اسکالر کی تصنیفات کثیر تعداد میں موجود تھیں۔

اسی اثنا میں نمازِ ظہر کا وقت ہو گیا تو نمازِ ظہر آیا صوفیہ میں ادا کی گئی جس کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ آیا صوفیہ میں یہ ہماری دوسری نماز تھی اور بہت باعثِ سعادت بات تھی۔ آیا صوفیہ سے نکلے اور سلیمانیہ مسجد کا قصد کیا تو بارش کے آثار نمودار ہوئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور سر چھپانا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے فوراً ہی رہائش گاہ پہنچنے کی ٹھانی کیا اور یوں سلیمانیہ مسجد کا دورہ ممکن نہ ہو سکا۔ یہ کہانی پھر سہی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سے مغرب تک روانگی کی تیاری جاری رہی اور نمازِ مغرب کے بعد استنبول ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ قصہ ۲۳ نومبر ۲۰۲۱ء کا ہے جبکہ ہم ترکش ایئر لائن کی پرواز میں واپسی کے لیے سوار ہوئے اور آج ۵ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو اس سفرنامے کی آخری قسط مکمل ہو رہی ہے۔ بہرحال ہم چھے گھنٹے کی ہموار پرواز کے بعد خیر و عافیت کے ساتھ وطنِ عزیز پہنچ گئے۔ یوں فاتح فاؤنڈیشن کے رضاکاروں کا یہ دس

روزہ تربیتی و سیاحتی دورہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ آخر میں ہم پاکستان اور ترکی کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے بالعموم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو خیر و عافیت نصیب فرمائیں اور قارئین کے لیے بھی غالبؔ کے دو شعر بطورِ دعا پیش کرتے ہیں:

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

* * * * *

استنبول میں واقع ایک قہوہ خانے کا منظر

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

ماہِ ربیع الاول کی مناسبت سے خصوصی تحریر

محبوب کی یاد، اپنے وجود میں کسی موسم کی محتاج ہو یا نہ ہو، اپنے وفور میں اوقات کی محتاج ضرور ہوتی ہے کہ بعض مواقیت، مواجیدِ عشق میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ آج ہم پھر ربیع الاول میں ہیں اور موضوع ذاتِ رسول ﷺ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ خورشیدِ نبوت کاملہ و خاتمہ کا اس عالمِ رنگ و بو میں ظہور، جمہور اہلِ اسلام کی رائے کے مطابق، ۱۲ ربیع الاول بروز پیر ہوا۔ علمائے کرام نے اس حسنِ انتخاب کی حکمتیں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تخلیقِ کائنات کے عظیم منصوبے میں پیر کا دن وہ تھا کہ جس میں روے ارضی پر درخت اور سبزے اگائے گئے جن پر حیاتِ ظاہری کا دارومدار ہے۔ اسی پیر کے دن رسولِ مقبول ﷺ کی پیدائش عمل میں لائی گئی کہ جن پر لوگوں کی روحانی و قلبی زندگی کا دارومدار تھا۔ ربیع بہار کو کہتے ہیں جس کی آب و ہوا معتدل ہوتی ہے اور اس میں اشجار و نبات میں روئیدگی اور نشو و نما ظہور کرتی ہے اور لوگ مادی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں پس ربیع الاول میں آپ ﷺ کی پیدائش گویا اس طرف اشارہ ہے کہ آپ لوگوں کے لیے اعتدال و توسط کی فراخی اور مادی و معنوی بہار لے کر آرہے ہیں۔ موسمِ ربیع و بہار قدرت کے احسانات، نعمتوں کی وسعت و بہتات اور ان چیزوں میں برکت و نشو و نما کا مظہر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ کی بعثت کو ایک احسان و امتنان کے طور پر ذکر کیا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ (آلِ عمران: ۱۶۴) ”یقیناً اللہ نے احسان کیا اہلِ ایمان پر جب انھی میں سے ایک رسول ان کی جانب مبعوث فرمائے“۔ جس

طرح بہار کا موسم، پژمردگی کا مانع ہے اسی طرح رسولِ کریم ﷺ کی ذات کو کفر سے ایک مانع کے طور پر ذکر کیا گیا: ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ﴾(آلِ عمران:١٠١) "تم کیونکر کفر کرتے ہو کہ جب کہ تم پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں"۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں ﴿كَيْفَ﴾ تعجب کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی آیات کے بعد رسولِ کریم ﷺ کی موجودگی، کفر سے ایک قوی مانع اور شبہات کے دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی کے بعد بھی کوئی کفر کرے تو بڑی حیرانی کی بات ہے"۔ ایک بار نبیِ کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ» "تم کیسے ایمان نہ لاتے کہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں" (الجامع الصحیح) جس طرح موسمِ بہار، پت جھڑ اور سرما کی سختیوں کا خاتمہ بن کر آتا ہے اسی طرح ذاتِ رسول ﷺ کو عذابِ الٰہی کے موانع میں ذکر کیا گیا، فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾(الانفال:٣٣) "اور اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا اے نبی جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں اور اللہ ان کو عذاب نہ دے گا جب تک وہ استغفار کرتے ہوں"۔

آپ ﷺ کی ہدایت یقیناً بابرکت ہے لیکن آپ کی برکت ہدایت ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کی ذاتِ شریف بھی برکت کا ایک منبع ہے۔ اس بات کی وضاحت فرمانِ رسول ﷺ سے ہوتی ہے۔ جب حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو اپنی ذات پر نفاق کا اندیشہ محسوس ہوا جس کی علامت انھوں نے یہ بتائی کہ آپ ﷺ کی مجلس میں جو حضوری کی کیفیت ہوتی ہے وہ مال و عیال کے اشتغال میں جاتی رہتی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنْ لَوْ تَدُومُونَ عَلَى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي، وَفِي الذِّكْرِ، لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً» "مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم دائمی طور پر اس طرح ہو جاؤ جیسے میرے پاس ہوتے ہو اور جیسا کہ تم ذکر کی کیفیت میں ہوتے ہو تو فرشتے تمھارے بستروں اور راستوں میں تم سے مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ یہ تو وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم) تو رسول اللہ ﷺ نے حضوری کی کیفیت میں

معاون دو چیزوں کا ذکر کیا ایک تو اپنی صحبت و محفل «مَا تَكُونُونَ عِنْدِي» اور دوسرے آپ ﷺ کا ذکر و تلقین «وَفِي الذِّكْرِ» اسی کی تفصیل سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے اس تبصرے میں ملتی ہے، فرماتے ہیں: لَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِي دَخَلَ فِيهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمَدِينَةَ أَضَاءَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِي مَاتَ فِيهِ أَظْلَمَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ وَمَا نَفَضْنَا أَيْدِيَنَا عَنِ التُّرَابِ وَإِنَّا لَفِي دَفْنِهِ حَتَّى أَنْكَرْنَا قُلُوبنَا ”جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے اس دن مدینہ کی ہر چیز روشن ہوگئی اور جس دن آپ ﷺ کا انتقال ہوا، ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا اور ہم نے آپ ﷺ کو دفن کر کے اپنے ہاتھ تک نہیں جھاڑے تھے اور آپ ﷺ کے دفن میں مشغول تھے کہ ہمارے دلوں میں تغیر پیدا ہو گیا“۔ صاحبِ مرقاۃ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لِانْقِطَاعِ مَادَّةِ الْوَحْيِ، وَفُقْدَانِ بِرْكَةِ صُحْبَتِهِ وَأَثَرِ إِكْسِيرِ حُضُورِ حَضْرَتِهِ ”کیفیتوں میں یہ فرق وحی کے انقطاع اور آپ ﷺ کی صحبتِ بابرکت اور آپ کی اکسیرِ اثر موجودگی کے فقدان کی وجہ سے آیا تھا“۔ اس میں کیا شک کہ رسول اللہ ﷺ کی برکتوں کو بچشمِ سر دیکھنے کا موقع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کو ملا۔ اسی دیکھنے کی عظمت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فضیلتوں کے حامل بنے۔ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ان الفاظ میں: «طُوبَى لِمَنْ رَآنِي وَمَنْ رَأَى مَنْ رَآنِي وَمَنْ رَأَى مَنْ رَأَى مَنْ رَآنِي» (المعجم الاوسط) ”بشارت ہے اس کے لیے جس نے مجھے دیکھا اور اس کے لیے بھی کہ جس نے میرے دیکھنے والوں کو دیکھا اور اس کو بھی بشارت کہ جس نے میرے دیکھنے والوں کے دیکھنے والے کو دیکھا“۔

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے

لیکن خدائے رحیم اور نبیِ کریم ﷺ نے بعد والوں کو بھی محروم نہیں رکھا بلکہ انھیں بھی بشارتوں سے نوازا گیا۔ کہیں تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے بعد والوں کو اپنا بھائی قرار دیا گیا: «أَنْتُمْ أَصْحَابِي وَإِخْوَانِي الَّذِينَ آمَنُوا بِي وَلَمْ يَرَوْنِي» ”تم میرے صحابی ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو مجھ پر ایمان لائے لیکن انھوں نے مجھے دیکھا نہیں“۔ (المعجم الاوسط)

اور کہیں ان کے ایمان کو خوبصورت ایمان قرار دیا گیا: «أَعْجَبَ النَّاسِ إِيمَانًا، قَوْمٌ يَجِيئُونَ مِنْ بَعْدِي، يُؤْمِنُونَ بِي وَلَمْ يَرَوْنِي» (المعجم الکبیر) ”لوگوں میں خوبصورت ترین ایمان والے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے“۔ ہدایت و ذاتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ و السلام دونوں کی برکت کا تسلسل، رسولِ پاک ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے بعد بھی جاری ہے، اس ضمن میں حرفِ آخر آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: «حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ تُحَدِّثُونَ وَيُحَدَّثُ لَكُمْ، وَوَفَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ يُعْرَضُ عَلَيَّ أَعْمَالُكُمْ، فَمَا رَأَيْتُ مِنْ خَيْرٍ حَمِدْتُ اللهَ عَلَيْهِ، وَمَا رَأَيْتُ مِنْ شَرٍّ اسْتَغْفَرْتُ اللهَ لَكُمْ» (کشف الاستار زوائد مسند البزار) ”میری زندگی تمھارے لیے بہتر ہے، تم مجھ سے (مشکلات و مسائل) بیان کرتے ہو اور (میری طرف سے) تمھارے لیے حل بیان کیے جاتے ہیں۔ اور میری وفات بھی تمھارے لیے بہتر ہے کہ تمھارے اعمال میرے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، جو اچھے ہوتے ہیں ان پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور جو اعمال برے ہوں ان پر میں اللہ کی جناب میں تمھارے لیے استغفار کرتا ہوں“۔

*****

مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ
رئیسِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

القواعد الفقهية

القاعدة الرابعة: إِذَا زَالَ الْمَانِعُ عَادَ الْمَمْنُوعُ

جب مانع زائل ہو جائے گا تو ممنوع اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آئے گا۔

تشریح

بعض دفعہ کوئی کام کسی وجہ سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ ممانعت ختم ہو جاتی ہے تو وہ کام اس طرح جائز ہو جاتا ہے جیسے ممانعت سے پہلے وہ کام جائز تھا، مثلاً:

۱۔ کسی پر حکومت کی طرف سے ایک مدت تک دفعہ ۱۴۴/ لگا دی جائے تو وہاں اجتماعِ نفوس منع ہو گا، مگر جیسے ہی وہ مدت ختم ہو گی تو وہ کام جو پہلے جائز تھا، وہ ایک سرکاری اعلان کی وجہ سے منع ہوا تھا، وہ پھر سے جائز ہو جائے گا۔

۲۔ کسی مقام پر ایک مدت کے لیے اسلحہ رکھنے کی پابندی ہو جائے تو عام آدمی کے لیے وہاں اسلحہ رکھنا جائز نہیں ہو گا، حالانکہ اسلحہ رکھنا جائز تھا، مگر ایک عارضی عذر یعنی سرکاری اعلان کی وجہ سے اسلحہ رکھنا ناجائز ہو گیا، مگر مدت ختم ہونے کے بعد اسلحہ رکھنے کی اجازت ہو گی کیونکہ یہ حکم ایک عذر کی وجہ سے ممنوع ہوا تھا، اب وہ عذر ختم ہو گیا تو اس عذر سے پہلے جو حکم تھا وہ لوٹ آیا۔

۳۔ ایک سمجھدار لڑکا (اپنی نابالغی کی عمر میں) کسی واقعے کا معائنہ کرے، یا ایک نابینا جو اپنی بینائی کے زمانے میں مشاہدہ کرے یا غلام اپنی غلامی کی حالت میں کسی واقعے کا مشاہدہ کرے، ان کی نابالغی، نابینائی اور غلامی کی حالت قبولِ شہادت سے مانع ہو گی

لیکن لڑکا بالغ ہوجائے، نابینا دوبارہ بینا ہوجائے اور غلام آزاد ہوجائے تو اب ان لوگوں کی شہادت قبول ہوگی، اس لیے کہ قبولِ شہادت کے لیے مانع زائل ہوگیا۔

۴۔ اسی طرح اگر کوئی کنیز اپنے شوہر کی وفات کی عدت میں ہو، اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے آقا کی خدمت کے لیے عدت کے مکان سے باہر نکلے۔ لیکن اگر اس کنیز کو عدت کے درمیان آزاد کر دیا گیا تو اب اس پر آزاد عورت کا حکم عائد ہوگا اور دورانِ عدت مکان سے نکلنا جائز نہ رہے گا، اس لیے کہ مانع زائل ہوگیا اور حکمِ ممنوع واپس آگیا۔

۵۔ اسی طرح جس کتابیہ عورت کو اس کے مسلم شوہر نے طلاق دے دی ہو، اس کے لیے عدت کے دوران عدت کے مکان سے باہر نکلنا جائز ہوگا، اس لیے کہ سکونت کا حق ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور اس طرح یہ ایک عبادت ہے اور کتابیہ عورت اس کی مکلف نہیں۔ البتہ دورانِ عدت اسلام لے آئی تو اس پر مسلمان عورت کی طرح عدت کے احکام جاری ہوں گے، اس لیے کہ دین کا اختلاف ان احکام کے نافذ ہونے سے مانع تھا اور جب یہ مانع زائل ہوگا تو اب حکم مرتب ہوگا اور گھر میں سکونت واجب ہوگی۔

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

عیدِ میلادُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سوال: عیدِ میلاد کے متعلق علماے دیوبند کیا فرماتے ہیں؟

جواب: علماے دیوبند کا موٴقف یہی ہے کہ میلاد کے موقعے پر مروجہ طرز سے عید منانا اور اسے حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لازمی تقاضا سمجھنا، اور پھر ستم بالاے ستم یہ کہ نہ منانے والوں کو ابلیس کہنا ایک ایسی بدعت سیئہ ہے جو عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ، تابعین و تبعِ تابعین کہیں سے ثابت نہیں۔ حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل تقاضا یہ ہے کہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے، یہ نہیں کہ شور شرابا، نعرے بازی، محافلِ نعت کی آڑ میں موسیقی اور بغض افشانی کرتے رہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: ''جشنِ عید میلاد کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو سننے اور سنانے کے لیے کوئی مجلس کسی خاص دن یا تاریخ کی قید کے بغیر منعقد کی جائے تو درست ہے بشرطیکہ اس کا مقصد آپ کے ذکرِ مبارک سے برکت حاصل کرنا اور سیرتِ طیبہ پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو۔ (فتاویٰ عثمانی: ۱/۵۱)

واللہ اعلم بالصواب

۲۹ جمادی الآولی ۱۴۴۰ھ بمطابق/۵ فروری ۲۰۱۹ء

فتویٰ نمبر: ۳۳۶۶

*****

سلیم احمد (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۳ء)

معروف نقاد اور شاعر

ادھوری جدیدیت (۲)

مارکس نے کہا تھا کہ فلسفہ اب تک دنیا کی تعبیر و تفسیر کرتا آیا ہے، اب اس کا کام دنیا کو بدلنا ہے۔ اقبال بھی دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

اقبال دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں اور دنیا کی تغیر پذیری کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ یعنی اس سلسلے میں ان کا رویہ بالکل جدید ہے۔ کیا یہ فکر کا تضاد ہے یا پریشان خیالی ہے یا کوئی جذباتی یا نفسیاتی کشمکش ہے؟ یہ سب بھی ہو سکتا ہے مگر اس سے کچھ سوا بھی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جدیدیت کے معنی اثبات کا دروازہ بند کرنے کے نہیں ہیں۔ جدیدیت ہر چیز کا اثبات کر سکتی ہے بشرطیکہ تجربہ اس کی تصدیق کرے۔ ارونگ بیسٹ کا کہنا ہے کہ جھگڑا جدیدیت کے تصور میں نہیں ہے کیونکہ گوئٹے، سینٹ بیو، وینٹاں آرنلڈ اور ان جیسے تمام لوگ اس کے ایک تصور پر متفق ہیں۔ جھگڑا تو ادھوری جدیدیت اور پوری جدیدیت میں ہے۔ ادھوری جدیدیت تجربے کی فوقیت کے نام پر عقیدے، سند، روایت اور خارجی دباؤ کا انکار کرتی ہے لیکن پھر اپنے انکار کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے مقابلے پر پوری جدیدیت انکار کی منزل سے گزرنے کے بعد اثبات کی طرف بڑھتی ہے اور جن چیزوں کو اس نے "تجربے"

کا اصول منوانے کے لیے رد کر دیا تھا، انھیں تجربے ہی کی تصدیق سے مان لیتی ہے، یا کم از کم اس امکان کو تسلیم کرتی ہے کہ تجرباتی تصدیق کے بعد انھیں مان لیا جائے گا۔ بدقسمتی سے مغرب اور اس کے اثر سے مشرق میں جو جدیدیت سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ ادھوری جدیدیت ہے۔ یہ جدیدیت عقائد، اخلاق اور معیارات کو رد تو کرتی ہے لیکن ان کی جگہ کوئی اپنا نظامِ اقدار نہیں دے سکتی۔ ہمیں ماننا چاہیے کہ انسان اگر اس کرۂ ارض پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اسے ایک نظامِ اقدار ضرور پیدا کرنا پڑے گا اور یہ جاننا کوئی جبر نہیں ہے بلکہ انسانیت کا اپنا انفرادی اور اجتماعی تجربہ ہے۔ پرانا نظامِ اقدار اگر ہمارے مطلب کا نہیں ہے یا فرسودہ اور از کارِ رفتہ ہو گیا ہے تو ہمیں اسے بے شک رد کر دینا چاہیے۔ لیکن پوری جدیدیت کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہو گا جب تک اس کی جگہ نیا نظامِ اقدار نہ پیدا کیا جائے۔ ادھوری جدیدیت رد کرنے کا کام تو انجام دیتی ہے مگر اپنی کوتاہ دستی کے باعث نئے نظامِ اقدار تک نہیں پہنچ سکتی۔ اقبال جدید ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ تخریبِ تمام کے بعد تعمیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ روایتی پسندیدگی کا نہیں ہے بلکہ انھوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ پورے غور و فکر کے بعد اسلام کو جدید دنیا کے تمام مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ ان کے اس خیال سے انکار کیا جا سکتا ہے مگر یہ طریقِ کار نہ صرف جدید ہے بلکہ پورا جدید ہے۔ مسئلے کی وضاحت کے لیے میں ایک بار پھر غالب کو سامنے رکھتا ہوں۔ غالب کو میں نے اردو کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا جدید شاعر کہا ہے۔ سب سے پہلا تو یوں کہ جدیدیت کے اصل اصول کی جو جنگ سب سے پہلے غالب نے اپنے شعور میں لڑی، وہ ابھی معاشرے میں مختلف سطحوں پر لڑی جا رہی ہے اور اپنی تمام رنگارنگی میں غالب ہی کے مختلف عناصر کو جھلکا رہی ہے۔ گویا جدیدیت کے تمام رنگوں کو اگر ہم ایک واحد شعلے میں دیکھنا چاہیں تو وہ شعلہ غالب کا شعور ہے۔ اور سب سے بڑا شاعر یوں کہ غالب نفی سے اثبات کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نفی کی کاوش اس کے یہاں بہت زیادہ نمایاں ہے اور اثبات کا پہلو اتنا اجاگر نہیں ہوا مگر انانیت پسند، انفرادیت پسند، داخلیت پسند اور ہر بت کو اپنی راہ کا سنگِ گراں سمجھنے والے غالب کا یہ اظہار ایک معنی رکھتا ہے کہ،

چاک مت کر جیب بے ایام گل

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

غالب کے اس قسم کے اشعار پر ابھی پورا غور نہیں کیا گیا کیونکہ معاشرے میں ابھی نفی کا اصول اپنی تکمیل تک نہیں پہنچا۔ ایک مشکل اور بھی ہے کہ جدید مغربی تہذیب نے اپنی روح کو پانے میں جو سفر کئی صدیوں میں کیا ہے، اسے ہمارے یہاں چند دہائیوں میں طے کیا گیا ہے اور وہ بھی پورے معاشرے میں نہیں بلکہ چند مخصوص طبقوں میں۔ اور معاشرے کی حالت یہ ہے کہ قدیم و جدید آپس میں اس طرح دست و گریباں ہیں کہ فیصلہ کسی ایک کے حق میں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے روایتی تصورات اور جدیدیت کے اثباتی تصورات میں فرق کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے، یعنی یہ تمیز دشوار ہو جاتی ہے کہ مثلاً اقبال کے اسلام اور مولانا احتشام الحق کے اسلام میں کیا فرق ہے؟ اصولوں کے اعتبار سے نہیں، اصولوں تک رسائی کے اعتبار سے۔ بہرحال غالب اور اقبال کے تقابل میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب جہاں جدیدیت کے منفی عمل کا عظیم ترین مظہر ہے، وہاں اقبال جدیدیت کے مثبت عمل کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس اعتبار سے جن لوگوں نے اقبال کو غالب کا نقشِ ثانی کہا ہے وہ بہت بڑی حد تک سچائی کے نزدیک ہیں۔ یہ ایک ہی شعور کی دو مختلف منزلوں کے نام ہیں۔ اچھا تو نفی کے عمل سے جو جدیدیت پیدا ہوتی ہے، غالب کے بعد اس کے ایک بڑے نمائندے یگانہ ہیں۔ اس سلسلے میں فانی، اصغر اور جگر وغیرہ کا نام لینا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ جس مخصوص زاویۂ نظر سے ہم گفتگو کر رہے ہیں اس میں ان بزرگوں کے تذکرے کی گنجائش مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ یگانہ کا منشور یوں تو ''حق پرستی کیجیے یا خود پرستی کیجیے'' ہے مگر حق پرستی کا ذکر برائے بیت ہے۔ اصل چیز اپنا تجربہ ہے۔

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

اس تجربے کی بنا پر وہ معتقدات کو مسترد کرتے ہیں اور ان سارے رویوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں جو روایتی تہذیب سے پیدا ہوئے ہیں، خواہ یہ رویے حسن و عشق کے روابط کے ہوں یا عام انسانی تعلقات کے۔ غالب اور یگانہ میں فرق یہ ہے کہ یگانہ یکسر منفی رویے کے شاعر ہیں۔ اپنے شعور کی کسی منزل پر بھی وہ غالب کی طرح اثبات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات تو گمان ہوتا ہے کہ منفی رویے کو اپنی آخری منزل سمجھتے ہیں۔ ''برا ہو پائے سرکش کا تھک جانا نہیں آتا''

تھک جانے کے معنی کسی منزل کو قبول کرنے کے ہیں جس کے لیے یگانہ تیار نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی شاعری اردو دنیا میں جدیدیت کے ایک پہلو کی شدید آگہی دینے کے باوجود کسی نئے نظامِ اقدار کی تشکیل سے عاری رہتی ہے۔ لیکن یگانہ کے برعکس فراق ایک نئے نظامِ اقدار کی طرف بڑھتے ہیں۔ فراق کی شاعری کا مرکز چوں کہ حسن و عشق کے روابط ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں نظامِ اقدار تک پہنچنے کا وسیلہ عشق ہے۔ یہ عشق روایتی عشق سے بہت مختلف اور اپنی روح میں نہایت جدید ہے اور عشق کے واسطے سے حسن بھی ایک نئی نفسیات، ایک نئی کائنات کا حامل ہے،

حسن سر تا پا تمنا، عشق سر تا پا غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

فراق کے یہاں نفی کے عمل کی صورت گری نہیں ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منزلیں انھوں نے اپنے تصور میں توطے کی ہیں لیکن ان کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن جدیدیت کے مثبت عمل کی آئینہ داری ان کے کلام میں بڑے حسن، رکھ رکھاؤ اور عظمت کے ساتھ ہوئی ہے۔ جوش کا ذکر رہا جاتا ہے لیکن ان کا تفصیلی مطالعہ میں کسی اور جگہ کر رہا ہوں۔ اب میں مختصراً ۱۹۳۶ء کے نئے ادیبوں کی تحریک سے متعلق چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ یہاں میں ہیئت کے تجربوں، نظمِ آزاد اور نظمِ معری کے استعمال، نئی علامات اور نئی موسیقی کی تلاش کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ بات جدید سے زیادہ نئی کہلانے کی مستحق ہیں۔ لیکن یہ کہہ کر میں ان کوششوں کی اہمیت گھٹا نہیں رہا ہوں، صرف اپنے متعیّن موضوع کی حدود میں رہنا چاہتا ہوں۔ نئے ادیبوں کی تحریک کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو آگے چل کر ترقی پسند کہلایا اور دوسرا حصہ وہ ہے جسے آزاد ادیبوں کا گروہ کہنا چاہیے۔ ابتدا میں یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں تھے اور ان کی جدیدیت کا مرکزی نقطہ روایت سے ان کا شعوری انحراف تھا، روایتی معاشرے سے بھی اور روایتی فن سے بھی۔ روایتی معاشرے سے انحراف کا پہلو مذہب کی مخالفت، عقیدوں کی بیخ کنی اور اخلاقیات کی نفی میں ظاہر ہو رہا تھا اور روایتی فن سے انحراف فن کے نئے نئے نظریات اور شاعری کے

نئے نئے تجربات میں۔ لیکن ابتدا میں نفی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا۔ اس لیے یہ تحریک ادھوری جدیدیت کی تحریک تھی۔ بعد میں کچھ مثبت اقدار کی ضرورت محسوس ہوئی تو صرف نفی کا کام چھوڑ کر اشتراکی اقدار کو اختیار کر لیا گیا۔ یہاں سے ترقی پسند نئے ادیبوں سے الگ ہو گئے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ترقی پسند ہمیشہ میرا جی، ن م راشد اور ان کے دوسرے رفقا پر نراجی، مریض، منفیت کا شکار ہونے کا الزام لگاتے ہیں لیکن اشتراکی اقدار کو جلد بازی میں یا سیاسی مصلحتوں کے تحت فوری طور پر قبول کرنے کا نتیجہ ادب کے حق میں اچھا بر آمد نہیں ہوا۔ اس سے ایک تو معاشرے میں نفی کے عمل کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ دوسری طرف جو اشتراکی اقدار قبول کی گئیں ان کی تجرباتی بنیاد واضح نہیں تھی۔ اشتراکیت پر کوئی تنقید میرا مقصود نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہمارے یہاں اشتراکی اقدار کی قبولیت، جدیدیت کے تجرباتی اثبات کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہوئی اور ترقی پسند تحریک ہمارے انفرادی اور اجتماعی شعور اور ہمارے تجربے کے درمیان ایک آڑ بن کر کھڑی ہو گئی۔ ترقی پسندوں نے تجربے کی کمی نظریے سے پوری کرنی چاہی، لیکن نظریے کی بندگی نمرود کی خدائی سے زیادہ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ تجربے کی جگہ اگر نظریہ لے سکتا تو روایتی معاشرے کے عقائد ہی کیا برے تھے۔ چند ہی برسوں کی ہنگامہ آرائی کے بعد وقت آ گیا کہ جدیدیت کی نئی رو اس نظریاتی جھانپلیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی۔ ترقی پسندوں کو اس کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا جب تک بالکل جدید نسل نے ان کی کھوکھلی، مصنوعی اور خلوص کی کمی کے باعث خطیبانہ شاعری کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہیں کر دیا سوائے فیض اور اختر الایمان کی شاعری کے کہ اشتراکی اقدار کے تجرباتی اثبات کی دلکش مثالیں ہیں یا ایک ہمارے احمد ندیم قاسمی ہیں جن کی شاعری میں پچھلے چند برسوں میں ایک نئی جان آئی ہے۔ اس سے برخلاف آزاد ادیبوں کا گروہ ان معنوں میں جدیدیت سے وفادار رہا کہ اس نے اپنے تجربے میں آئے بغیر کسی قسم کے جھوٹے اثبات کو قبول نہیں کیا۔ میرا جی کے بعد راشد نے اس کام کو جاری رکھا ہے اور ان کے بعد کی نسل میں ضیا جالندھری ابھی تک اس راستے پر گامزن ہیں۔ گو کہ مختار صدیقی اور یوسف ظفر میں روایت کی ایک نئی تجرباتی قبولیت کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کسی نئے نظامِ اقدار کی تخلیق کی تھوڑی سی سکت بھی ہے یا نہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جدید شاعری کے دو گروہ ابھرے۔ ایک وہ جس کا کام پاکستان کے فوراً بعد منصۂ شہود پر آیا اور

جنھوں نے ۵۸۔۱۹۵۷ء تک بہت بڑی حد تک پڑھنے والوں کے شعور میں جگہ پیدا کرلی۔ دوسرا گروہ ۵۸۔۵۷ء کے قریب ابھرا ہے اور ادبی تاریخ میں اپنی جگہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ ان میں سے کچھ میراجی کی روایت میں لکھ رہے ہیں اور کچھ ترقی پسند تحریک کے جھوٹے اثبات کے ردِعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ اول الذکر پاکستان میں اور موخرالذکر ہندوستان میں۔ جدید شعرا کی اس نسل میں نفی کا رجحان بہت شدید ہے۔ ایک معنوں میں قدیم سے جدیدیت کی وہ لڑائی جس کا آغاز غالب سے ہوا تھا، اب شاعری میں اپنی تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔ فرد سارے رشتوں کو توڑ کر اپنا پیمانۂ اقدار آپ بن چکا ہے۔ مذہب، عقیدہ، اخلاق، قانون، معاشرتی اصول، فن و زبان کے ضابطے اور قاعدے، سب اس کے نزدیک بے معنی ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہ کسی تہذیب کا نمائندہ تصور کرتا ہے نہ کسی قوم کا فرد۔ اس کی نہ کوئی جماعت ہے نہ کوئی تنظیم۔ وہ معاشرے میں بے آسرا، ہجوم میں تنہا اور شہر میں جنگل کا باسی۔ ان رجحانات کے نمائندہ شعرا کی تخلیقات شاعری کے اعتبار سے اپنی حدود میں اچھی بری، پست و بلند ہر طرح کی ہیں جن کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سب کی سب اس بات کا مکمل اظہار کرتی ہیں کہ جدیدیت کا منفی پہلو جس شدت سے اب نمایاں ہوا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ذاتی طور پر میں اس شاعری کے بیشتر حصے کا قائل نہ ہونے کے باوجود نوجوانوں کو یہ حق دینے کے حق میں ہوں کہ وہ اپنے تجربے کو بنیاد بنا کر جس چیز کو رد کرنا چاہیں رد کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ یہ جدیدیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ادھوری جدیت کبھی پوری جدیدیت بنتی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ سوال شاید قبل از وقت ہے کیونکہ ان کے یہاں نفی کا عمل ابھی اس سنجیدہ سطح پر نہیں پہنچا جہاں ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم زیادہ دیر تک ٹھہر سکے۔

ماخذ: مضامینِ سلیم احمد

* * * * *

سفرنامہ: مفتی اویس پاشا قرنی

ضبط و ترتیب: مولانا محمد اقبال

افغان نامہ (۳)

سفرِ افغانستان کی مختصر روداد

افغانستان تین سپر پاورز کا قبرستان!

افغانستان کی تاریخ رہی ہے کہ یہاں کسی طالع آزما کو آرام سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا، افغان قوم نے کبھی کسی باہر سے آئے ہوئے دشمن کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ اگر وقتی طور پر کسی کو کامیابی ملی بھی تو بالآخر اسے افغان قوم کے سامنے ڈھیر ہونا پڑا۔ آپ افغانستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو یہاں اس سرزمین پر وقت کی تین سپر پاورز؛ سب سے پہلے ناقابلِ شکست برطانیہ، پھر سُرخ ریچھ سوویت یونین اور آخر میں نیو ورلڈ آرڈر کے ٹھیکے دار امریکہ کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود کہ یہاں کے لوگوں کے پاس معیاری زندگی گزارنے کے لیے بنیادی وسائل بھی نہیں ہیں، چہ جائے کہ جدید جنگی اور مادی وسائل کی دستیابی ہو، اس کا تو یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی یہ ڈٹے رہے اور وقت کے فرعونوں کو تاریخی سبق سکھایا۔

برٹش ایمپائر کی ہزیمت

انیسویں صدی میں سلطنتِ برطانیہ جو اس عہد میں سپر پاور تھی، اس نے افغانستان کی سرزمین پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامی سے دوچار ہوئی۔ سلطنتِ برطانیہ نے افغانستان پر ۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۹ء تین مرتبہ حملہ کیا اور ان میں تینوں بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ۱۸۳۹ء کی پہلی اینگلو افغان جنگ میں برطانیہ نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ مگر

دلیر افغان قبائل نے دنیا کی طاقتور ترین فوج کو انتہائی معمولی ہتھیاروں سے تباہ کر دیا اور برٹش فوج کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ تین سال کی لڑائی میں برٹش فوج کا سخت نقصان ہوا اور افغان قبائل نے حملہ آور فوج کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جب ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو سولہ ہزار فوجی برٹش کیمپ سے جلال آباد روانہ ہوئے تو واپسی میں ان ہزاروں میں سے صرف ایک برطانوی شہری زندہ بچ کر واپس آیا۔ یہ برطانیہ کے لیے ایک ایسا حادثہ تھا کہ جس نے برصغیر میں برطانوی راج اور اس کی توسیع پسندانہ پالیسی کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس حادثے نے اس تصور کا خاتمہ کر دیا کہ انگریز ناقابلِ تسخیر ہیں۔ اس حملے کے بعد پھر چار دہائیوں تک اسے افغان سرزمین پر حملہ کرنے کی جُرأت نہیں ہوئی۔ چار دہائیوں کے بعد برطانیہ نے ایک بار پھر افغانستان پر قبضے کی کوشش کی اور ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء کے درمیان دوسری اینگلو افغان جنگ کے نتیجے میں اس بار اسے کچھ کامیابی ملی۔ اس کے بعد سلطنتِ برطانیہ نے ایک نیا افغان امیر منتخب کر کے اپنی فوجیں ملک سے واپس بلا لیں۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں جب اس امیر نے خود کو برطانیہ سے آزاد قرار دیا تو تیسری اینگلو افغان جنگ شروع ہوئی۔ چار ماہ کی جنگ کے بعد برطانیہ نے بوجوہ افغانستان کو ۱۹۱۹ء میں آزاد قرار دے دیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین جو وقت کی سب سے بڑی طاقت تھی، نے افغانستان پر حملہ کیا۔ اس نے وہاں ۱۹۷۸ء میں بغاوت کے ذریعے قائم کی گئی کمیونسٹ حکومت کو گرنے سے بچانے اور اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے حملہ کیا۔

سوویت یونین کی شکست وریخت

افغان معاشرہ ایک اسلامی اور قبائلی معاشرہ ہے، بعض ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے جو یورپ کی تہذیب سے متاثر تھے، یہاں جدت پسندی اور نام نہاد روشن خیالی کے نام پر اسلامی اور افغان قبائلی روایات کے برعکس اقدامات کیے جن میں بے حیائی کے فروغ کے لیے خواتین کی آزادی اور مغربی رسم ورواج کی پذیرائی جیسے اقدامات شامل تھے۔ روشن خیال حکمرانوں اور نام نہاد اصلاح پسندوں کی ان کوششوں نے مذہبی اور قبائلی رہنماؤں کو احتجاج پر مجبور کر دیا، جس کا نتیجہ ملک میں خانہ جنگی کی صورت میں نکلا۔ یہ کشیدگی کئی دہائیوں تک رہی اور بالآخر فوجی بغاوت ہوئی۔ اس فوجی بغاوت کے نتیجے میں کمیونسٹ حکومت وجود میں آئی جس سے حالات مزید کشیدہ ہوئے اور اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے افغانستان پر

حملہ کر دیا تاکہ کمیونسٹ حکومت کو برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کی جاسکے۔ کمیونزم جو اسلامی اور افغان روایات کے خلاف ایک نظام ہے، اس کے خلاف جہاد کا آغاز ہوا اور کئی جہادی تنظیموں نے سوویت یونین کی مخالفت کی اور ان کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کا آغاز کیا۔ سوویت یونین کے خلاف اس جنگ میں مجاہدین نے بڑی قربانیاں دیں۔ پڑوسی ملک پاکستان نے مجاہدین کی ہر سطح پر مدد کی اور دیگر اسلامی ممالک نے بھی مجاہدین کو ہر قسم کی مالی مدد فراہم کی۔ عالمی طاقتوں نے بھی سوویت یونین کے مقابلے کے لیے سرد جنگ کا آغاز کیا ان میں امریکہ سرِفہرست ہے۔ اس جنگ میں شروع میں سوویت یونین کی فوج بڑے شہروں پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی، لیکن دیہی علاقوں اور پہاڑوں میں مجاہدین نے اپنے ٹھکانے بنائے۔ روسی فوج نے مجاہدین کے تعاقب میں بے شمار دیہاتوں پر زمینی اور فضائی حملے کیے جن کی وجہ سے بڑی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی لقمۂ اجل بنے۔ ایک بڑی آبادی اپنے گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئی اور پڑوسی ممالک کی طرف ہجرت کی۔ اس جنگ میں مقتولین کی تعداد تقریباً ۱۵ سے ۱۷ لاکھ تک بتائی جاتی ہے اور تقریباً پچاس لاکھ لوگ ہجرت کر گئے۔ سوویت یونین کی فوج نے مظالم کی انتہا کر دی۔ مجاہدین کے خاتمے کے لیے بھرپور کوششیں کیں، لیکن مجاہدین نے گوریلا جنگ لڑنے کا آغاز کیا اور یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی، کیونکہ ایسی جنگ میں وہ دشمن کے حملوں سے بچ جاتے تھے۔ بہرحال اس جنگ میں پورا ملک تباہ ہو گیا، مگر سوویت یونین کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ سوویت یونین کو اپنی ساری جنگی حکمت عملیوں اور پوری طاقت استعمال کرنے کے باوجود مقامی گوریلا جنگجوؤں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ سوویت یونین کی گرفت اپنے علاقوں پر بھی ڈھیلی پڑ گئی اور بالآخر جنگی اخراجات کے بوجھ تلے دب کر روس ہمیشہ کے لیے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کئی ممالک کو اس جہاد کے نتیجے میں سوویت یونین سے آزادی ملی، ان میں افغانستان کے پڑوسی اسلامی ممالک؛ تاجکستان، ترکمانستان، ازبکستان، قزاقستان وغیرہ شامل ہیں۔ افغان جنگ کی ناکامی کے بعد اسی وقت کے سوویت لیڈر میخائل گورباچوف نے ۱۹۸۹ء میں اپنی فوجیں واپس بلالیں۔

امریکہ کی شرمناک پسپائی

جب سوویت یونین نے افغان سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کیا اور یہاں کے عوام کی مرضی اور روایات کے برعکس کمیونسٹ حکومت بنائی تو اس کے مقابلے میں کئی افغان جہادی تنظیموں نے جہاد کا آغاز کیا تو اس جدوجہد میں ان کے ساتھ پڑوسی ممالک

کے عوام نے بھی ساتھ دیااور رفتہ رفتہ بین الاقوامی طاقتیں بھی اپنے اپنے مفاد کے لیے متحرک ہوتی چلے گئیں۔ افغان عوام کی بے پناہ قربانیوں کے نتیجے میں روس پسپا ہوااور سوویت یونین نے جنیوا معاہدے کی رو سے ۱۹۸۹ء میں اپنی فوجیں نکال لیں۔ اب ہونا یہ چاہیے تھا کہ افغانستان میں افغان عوام کی مرضی سے ایک ایسی حکومت بنائی جاتی جو امن و امان کے قیام کے لیے اقدامات کرتی اور دس سالہ خون ریز جنگ کی تلافی کرتی، مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوابلکہ ایک ایسا خلا پیدا ہوا کہ افغانستان معطل ہو کر رہ گیا۔ اسی خلا کو پر کرنے کے لیے طالبان کی تحریک برپا ہوئی۔ طالبان نے بہت جلد پورے افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا اور امن و امان کے قیام کے لیے بہترین اقدامات کیے۔ ملا محمد عمر مجاہد رحمہ اللہ کی قیادت میں تشکیل پانے والی حکومت ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک قائم رہی، اس نے افغانستان سے منشیات کا مکمل خاتمہ کیا اور ایک پر امن افغانستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ طالبان کی اس حکومت کو سوائے دو مسلم ممالک پاکستان اور سعودیہ کے دنیا نے تسلیم نہیں کیا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جنگ زدہ ملک میں امن و امان برقرار رکھنے اور معاشی و سیاسی اصلاحات لانے کے لیے طالبان حکومت کی مدد کی جاتی اور انھیں ایک موقع دیا جاتا، مگر بد قسمتی سے ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ جب نائن الیون کا حادثہ پیش آیا تو امریکہ نے بغیر تحقیق کے اس کا ذمے دار اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا جو ان دنوں افغانستان میں موجود تھے۔ امریکہ نے اس واقعے کا الزام ان پر اور ان کی تنظیم القاعدہ پر عائد کرتے ہوئے طالبان حکومت سے ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ ظاہر ہے امریکہ کا یہ مطالبہ اسلامی تعلیمات، افغان روایات اور عالمی برادری کے درمیان طے شدہ اصولوں کے منافی تھا۔ طالبان حکومت نے اسامہ بن لادن کی حوالگی سے انکار کرتے ہوئے اپنے ملک کے اندر اس واقعے کی تحقیق کی پیشکش کی اور یہ یقین دہانی کرائی کہ اس واقعے میں ملوث کرداروں کو عدالت کے ذریعے سزا دلوائی جائے گی۔ طالبان حکومت کی اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے نیو ولڈ آرڈر کے ٹھیکیدار امریکہ نے نیٹو میں شامل چالیس اتحادیوں کے ہمراہ بین الاقوامی اصولوں اور انسانی قدروں کو پامال کرتے ہوئے انتہائی رعونت و فرعونیت کے ساتھ سات اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا۔ بعد ازاں افغان سرزمین پر قبضہ کر کے بے گناہ افغانیوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ امریکہ کی سرپرستی میں افغانستان میں حامد کرزئی کو صدارت کے عہدے پر بٹھایا گیا، جو ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۴ء تک اس عہدے پر برقرار رہا۔ اس کے بعد اشرف غنی کو صدر بنایا گیا، جو ۲۰۲۱ء میں طالبان کی فاتحانہ واپسی کے نتیجے میں ملک چھوڑ کر فرار ہوا۔ امریکہ نے کل بیس

سال افغانستان کی سرزمین پر قبضہ جمائے رکھا اور ان بیس سالوں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مظالم کی بے شمار داستانیں رقم کیں۔ افغان ملت نے امریکہ اور اتحادیوں کے خلاف بھرپور جہاد کیا اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس بے پناہ وسائل کے مالک نیٹو کو مٹھی بھر جماعت نے شکست سے دوچار کر دیا۔ دو دہائیوں سے جاری اس جنگ میں ہزاروں قیمتی جانیں لقمۂ اجل بن گئیں۔ اس جنگ میں امریکہ نے دو ہزار ارب ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی جس کا کوئی نتیجہ اس کے حق میں سامنے نہیں آیا۔ بالآخر امریکہ نے طالبان کے ساتھ مذاکرات شروع کیے جو مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے ۲۰۲۰ء کے دوران "دوحہ" میں امریکہ اور طالبان کے درمیان ایک امن معاہدے پر منتج ہوئے، جس کی رو سے ۲۰۲۱ء میں امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کے افغانستان سے انخلا پر اتفاق ہوا۔ یوں ایک اور سپر پاور کو افغانستان میں ذلت آمیز پسپائی اور شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ خلاصہ یہ کہ یہ اعزاز افغان قوم کو ہی حاصل ہے کہ بہت کم مادی اور فوجی وسائل کے ساتھ انھوں نے وقت کی تین سپر پاورز کو یکے بعد دیگرے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان اب تک تین فرعونیت کے نشے میں دھت سپر پاورز کا قبرستان ثابت ہو چکا ہے۔ وللہ الحمد اولا و آخرا

کتابیات

الكامل في التاريخ (لابن الأثير)

افغانستان د تاریخ په رڼا کی (استاد احمد علی کهزاد)

افغانستان د معاصر تاریخ په رڼا کی (شهسوار سنگر وال)

له احمد شاه بابا سره تر حامد کرزی

د افغانستان تاریخ له اصحابانو ترطالبانو(حانواک مفتی زاده)

د افغانستان پر معاصر تاریخ یوه لنده کتنه (ڈاکٹر ابراهیم عطائی)

سیرِ افغانستان (مولانا سید سلیمان ندوی)

تاریخِ افغانستان (مولانا اسماعیل ریحان)

جاری ہے

****

ٹینکوں کا قبرستان

غزنی شہر کے مضافات میں ٹینکوں کا قبرستان ہے، یہاں روسی ٹینک بھی پڑے ہوئے ہیں اور امریکیوں کا بھی بہت سا سامان یہاں مدفون ہے۔